اخبار الرایہ

شمارہ نمبر 620

(07-اکتوبر-2026)

(عربی سے ترجمہ)

ترکیہ اور یونان کے درمیان تنازع اور کشیدگی کے اسباب..2
روہنگیا مسلمانوں کی کسمپرسی: فراموشی کی نذر...6
ہماری فوج کے کمانڈر دشمن فوج کے کمانڈروں سے ملاقات کیوں کرتے ہیں؟..10
یمن کے لیے استعماری طاقتوں کے قدم جمانے والے آلات سے چھٹکارا پانے کے سوا کوئی نجات نہیں................................12
ایک اور "5+1" سربراہی اجلاس...13
روس کے خلاف سیکیورٹی صف بندی اور یورپی جنگی بیانیے میں بڑھتی ہوئی شدت کے پس پردہ عوامل کا تجزیہ..........................17
فلسطین کی نصرت کا راستہ معلوم ہے، نامعلوم نہیں..22
اردن-فرانس دفاعی تعاون کا معاہدہ: اردنی افواج کو استعماری تنازعے میں جھونکنے کی کوشش..23
سوڈانی حکومت اور بحرانوں کی پیداوار: اینڈ حسن بطور ایک عملی مثال...27
معاشی بحرانوں کے حقیقی حل اور بنیادی علاج کی طرف...28
امریکہ اور ایران کے مابین جنگ: غالب قوت بمقابلہ ابھرتی ہوئی طاقت...29
جوں جوں "دردِزہ" شدت اختیار کر رہا ہے، دنیا کس نومولود کی منتظر ہے؟...33
امت ان لوگوں کی کثرت سے زندہ نہیں ہوتی جو اسلام کا محض زبانی دعویٰ کرتے ہیں؛ بلکہ یہ ان لوگوں سے زندہ ہوتی ہے جن کے دل اسلام سے لبریز ہوں...38
اب وقت آ گیا ہے کہ ہماری امت اپنی اس طاقت اور اثر و رسوخ کا ادراک کرے جو اس کے پاس موجود ہے..................................39
اگر ہماری امت نے اسلام کو اپنا معیار نہ بنایا تو دوسروں کے نظریات اس کا معیار بن جائیں گے..40

اہلِ سوڈان پر لازم ہے کہ وہ دارفور کو الگ کرنے کی امریکی سازشوں سے باخبر رہیں اور فریب و گمراہ کن پروپیگنڈے کے جال میں پھنسنے سے بچیں، بالکل اسی طرح جیسے اس سے قبل وہ جنوبی سوڈان کی علیحدگی کے جرم کے دوران اس کا شکار ہوئے تھے۔ انہیں چاہیے کہ وہ بااثر اور طاقتور طبقات (اہلِ قوت واثر) کو حزب التحریر کو نصرۃ (عسکری مدد) فراہم کرنے پر آمادہ کر کے امریکہ اور دیگر استعماری ممالک کے ہاتھ کاٹ ڈالیں۔ اس کا مقصد نبوت کے نقشِ قدم پر خلافتِ راشدہ کا قیام ہے، جو نہ صرف سوڈان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے روکے گی، بلکہ اسے باقی تمام مسلم سرزمینوں کے ساتھ یکجا کر دے گی، تاکہ استعماری کافروں کا تسلط ختم کیا جا سکے اور اس دنیا میں ہدایت، نور اور رحمت پھیلائی جا سکے جسے سرمایہ داریت (کیپٹلزم) نے گمراہی، فساد اور کمزوروں کی غلامی سے بھر دیا ہے۔

اداریہ

ترکیہ اور یونان کے درمیان تنازع اور کشیدگی کے اسباب

تحریر: استاد اسعد منصور

(ترجمہ)

11 تا 13 ستمبر 2026ء کے دوران یونانی وزیرِ اعظم کیریاکوس مِتسوتاکِس (Kyriakos Mitsotakis) کے دورے کے بعد ترکیہ اور یونان کے مابین کشیدگی میں شدت آگئی۔ انہوں نے بحیرۂ روم میں ترک سرحد کے بالکل قریب واقع یونانی جزائر کا دورہ کیا تاکہ وہاں تعینات یونانی افواج کا معائنہ کر سکیں، بالخصوص جزیرۂ میس (کاسٹیلوریزو) کا، جو ترک ساحل سے محض دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کے اس دورے سے یہ بات طشت از بام ہو گئی کہ ان جزائر پر بھی فوج موجود ہیں جنہیں غیر عسکری علاقے (demilitarized zones) قرار دیا گیا تھا، جس کے ردِ عمل میں ترکیہ نے متصل علاقوں میں اپنی فوج تعینات کر دی۔

عثمانیوں نے یونان کو فتح کیا تھا اور تقریباً 400 سال تک وہاں اسلامی عدل و انصاف کے تحت نظامِ حکومت چلایا۔ بالآخر برطانیہ، فرانس اور روس نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف سازش کی اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی، یہاں تک کہ انہوں نے اسے یونان سے نکال باہر کیا اور 1830ء میں اس ملک کو آزادی دے دی۔ تاہم، پہلی جنگِ عظیم تک بہت سے جزائر بدستور عثمانیوں کے زیرِ انتظام رہے۔ 1923ء کے معاہدۂ لوزان میں، مصطفیٰ کمال، وہ شخص جس نے خلافت اور شریعت کا خاتمہ کیا تھا، نے یہ جزائر یونان کے حوالے کر دیے، اور صرف انہی جزائر کو قبول کیا جو برطانیہ اور فرانس نے ترکیہ کو دیے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض جزائر یونانی سرزمین سے 600 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہیں، جبکہ بحیرۂ ایجین میں وہ ترک ساحل سے بمشکل دو کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہیں۔ بحیرۂ ایجین تقریباً 1,800 جزائر، چھوٹے جزائر اور چٹانی سلسلوں پر مشتمل ہے؛ جن میں سے 100 آباد ہیں اور 24 کا رقبہ 100 مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے۔

یہ تنازعات بنیادی طور پر درج ذیل امور کے گرد گھومتے ہیں:۔

- بہت سے جزائر کی حیثیت ابھی تک غیر طے شدہ ہے؛ ترکیہ ان پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے، جبکہ یونان ان دعوؤں کو مسترد کرتا ہے اور صرف انہی حقوق کو تسلیم کرتا ہے جو معاہدۂ لوزان کے تحت ترکیہ کو دیے گئے تھے۔
- یہ تنازع ان جزائر سے متعلق ہے جنہیں "ڈوڈیکانیز جزائر" (Dodecanese Islands – جس کا لفظی مطلب "بارہ جزائر" ہے) کہا جاتا ہے، جو درحقیقت چودہ جزائر اور مزید دس چھوٹے جزائر و چٹانی سلسلوں پر مشتمل ہیں۔
- سمندری حدود پر تنازعات، جن میں یونان اپنے سمندری پانیوں (territorial waters) کو بارہ میل تک وسعت دینے کی کوشش کر رہا ہے، جس اقدام کی ترکیہ مخالفت کرتا ہے۔
- جزائر کو عسکری رنگ دینے سے متعلق تنازعات، خاص طور پر جسے "مشرقی بحیرۂ ایجین کے جزائر کی غیر عسکری حیثیت کی یونان کی جانب سے خلاف ورزی" کہا جاتا ہے۔ ترکیہ ترک ساحل کے بالکل قریب واقع ان جزائر پر یونانی فوجی موجودگی پر اعتراض کرتا ہے، اور اسے 1947ء کے پیرس امن معاہدے کی خلاف ورزی سمجھتا ہے جو جزائر کو غیر عسکری رکھنے کا پابند بناتا ہے؛ دوسری طرف، یونان سیکیورٹی خطرات کا حوالہ دے کر اس موجودگی کا جواز پیش کرتا ہے۔
- قبرص کا مسئلہ: یہ جزیرہ منقسم ہے؛ یونان بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ جنوبی یونانی حصے کی حمایت کرتا ہے اور شمالی حصے کو، جہاں "شمالی قبرص کی ریاست" کا اعلان کیا گیا تھا، اس میں ضم کرنے کا خواہاں ہے۔ اس شمالی وجود کو ترکیہ تسلیم کرتا ہے اور اس کا تحفظ کرتا ہے، جس نے وہاں تقریباً 30,000 فوجیوں پر مشتمل چھاؤنی تعینات کر رکھی ہے۔
- یونان اور قبرص کے یونانی حصے کے درمیان بجلی کے باہمی رابطے کا منصوبہ (electrical interconnection project)؛ ترکیہ کا مطالبہ ہے کہ اس معاملے اور اس سے متعلقہ امور پر اس سے باقاعدہ منظوری لی جائے۔
- یونان اور یہودی وجود کے مابین فوجی تعاون: خطے نے دونوں فریقوں کے درمیان مشترکہ بحری مشقوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ 31 اگست 2026ء کو "ایکلیز شیلڈ" (Achilles' Shield) نامی فضائی دفاعی نظام کا

منصوبہ قائم کرنے کے معاہدے کا اعلان کیا گیا۔ یونان ترکیہ کے ساتھ اپنے تنازعات کو اچھالنے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی طرف مائل رہتا ہے، بالخصوص جب اسے اندرونی مسائل یا ملکی چیلنجز کا سامنا ہو۔ آئندہ سال کے پہلے ششماہی میں عام انتخابات کے پیشِ نظر، یونانی وزیرِ اعظم نے بحیرۂ روم میں ترک سرحد کے بالکل قریب واقع یونانی جزائر کا دورہ کیا، جن میں ترک ساحل سے محض 2 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع جزیرۂ میس بھی شامل ہے۔ اس دورے کے دوران انہوں نے اس جزیرے پر یونانی افواج کی موجودگی کو ظاہر کیا، حالانکہ دونوں ممالک کے مابین طے پانے والے معاہدے وہاں فوجی موجودگی کی ممانعت کرتے ہیں۔

یونان معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، بحیرۂ ایجین کے جزائر پر اپنی دفاعی صلاحیتوں اور فوجی ڈھانچے کو مضبوط بنا کر اور اپنی سمندری حدود کو وسعت دینے کی کوشش کر کے ترکیہ کو للکارتا ہے؛ وہ ایسا اس لیے کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود ترکیہ نے ماضی میں اس کے خلاف کبھی کوئی سنجیدہ فوجی کارروائی نہیں کی۔ حالانکہ یہ حقیقت بھی موجود ہے کہ دونوں ممالک امریکی کمان کے تحت ایک ہی فوجی اتحاد کے اندر اتحادی ہیں۔

تاہم، 2020ء میں اسی اتحاد کے دوسرے شراکت دار فرانس نے ترکیہ کے خلاف یونان کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی؛ اس نے اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی غرض سے بحری جنگی اثاثے تعینات کیے اور مشترکہ فوجی مشقیں منعقد کیں۔ لیکن امریکہ نے مداخلت کی، یونان پر دباؤ ڈالا اور اعلان کیا کہ وہ اس گیس پائپ لائن کے لیے کوئی مالی یا سیاسی مدد فراہم نہیں کرے گا جسے یونان یورپ کو گیس فراہم کرنے کے لیے یہودی وجود کے ساتھ شراکت داری میں تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ نتیجتاً فرانس کے منصوبے ناکام ہو گئے اور یہ منصوبہ ختم ہو گیا۔

اردوغان کا ترکیہ امریکہ کے مدار میں گردش کرتا ہے، اسی کے مفادات کی خدمت کرتا ہے اور بیرونِ ملک صرف اسی کے ساتھ تال میل کر کے کارروائی کرتا ہے؛ چنانچہ وہ یونان کے ساتھ اپنے تنازع میں بھی امریکہ پر ہی تکیہ کیے ہوئے ہے اور اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ امریکہ اسے آگے بڑھنے کا کیا اشارہ دیتا ہے۔ ترکیہ نے امریکہ کی ہدایت پر شام، لیبیا اور آذربائیجان میں فوجی تحرک تو دکھایا، لیکن وہ غزہ کے عوام کی مدد کے لیے حرکت میں آنے میں ناکام رہا، جو یہودیوں کے ہاتھوں مسلسل نسل کشی کا شکار ہیں، کیونکہ امریکہ نے جنگ کے پھیلاؤ کو روکنے کا بہانہ بنا کر اسے منع کر دیا تھا۔ یہاں

تک کہ صدر ٹرمپ نے ترکیہ کی اس بات پر تعریف بھی کی کہ جب یہودی وجود نے چالیس دن سے زیادہ عرصے تک ایران پر بمباری کی تو ترکیہ نے کسی قسم کی مداخلت سے گریز کیا۔

امریکہ یونان میں اپنے اثر ورسوخ کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، اور یونانی جزائر پر اپنے فوجی اڈوں کو مزید فوجیوں اور ساز و سامان کے ذریعے وسعت دے کر مضبوط بنا رہا ہے۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتا کہ ترکیہ یونان کے ساتھ کشیدگی کو بڑھائے؛ بلکہ وہ مفاہمت پر زور دیتا ہے اور اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ جب بھی کوئی تناؤ پیدا ہو تو دونوں ممالک کے حکام کشیدگی کم کرنے کے لیے آپس میں ملاقات کریں۔

یونان امریکہ سے خائف ہے اور یورپی یونین کی رکنیت کے ناطے یورپی حمایت پر انحصار کرتا ہے، بالخصوص فرانس پر، جو بدلتے ہوئے حالات اور اپنے رہنماؤں کی خواہشات کے مطابق وقتی پالیسیاں وضع کرنے اور پھر بعد میں ان سے دستبردار ہو جانے کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ اس سے قبل بھی جب اس نے ترکیہ کے خلاف یونان کی حمایت کی تھی، تو امریکی اقدام کے بعد وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ نتیجتاً، یونان کی دھمکیاں ایک مخصوص دائرے تک ہی محدود رہتی ہیں؛ وہ ترکیہ کے ساتھ عسکری تصادم کی سکت نہیں رکھتا، اور یونانی ترکوں سے خوفزدہ ہیں۔ اگر ترکیہ کے حکمرانوں کے پاس عثمانی فاتحین جیسے کہ محمد الفاتح اور سلیمان قانونی جیسی حقیقی، خودمختار مرضی، شجاعت اور اخلاص کی صفات ہوتیں، تو وہ ان جزائر کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے پیش قدمی کرتے۔

امریکہ یونان کی سیاسی صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو، اسے تنہا نہیں چھوڑے گا، کیونکہ یہ وہ مغربی ریاست ہے جس کی سرحدیں مشرقی بحیرۂ روم کے مسلم علاقوں سے براہِ راست ملتی ہیں، اور یہ مغرب کے لیے ایک انتہائی اہم فوجی اڈے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ان جزائر پر اپنی عسکری موجودگی کو مضبوط بنا رہا ہے، شاید ایک پیشگی ہنگامی اقدام کے طور پر تاکہ اگر ترکیہ کا سیاسی منظرنامہ تبدیل ہو جائے اور امریکہ کو اپنے اڈے بند کر کے فوجیں نکالنے پر مجبور ہونا پڑے، تو اس کے پاس متبادل موجود ہو۔ امریکہ ایسے کسی بھی منظرنامے سے خوفزدہ ہے، کیونکہ ترکیہ کے عوام مسلمان ہیں، جن میں ایسے مخلص افراد موجود ہیں جو بنیادی اور انقلابی تبدیلی اور نبوت کے نقشِ قدم پر دوسری خلافتِ راشدہ کے دوبارہ قیام کے لیے کوشاں ہیں۔

روہنگیا مسلمانوں کی کسمپرسی: فراموشی کی نذر

تحریر: استاد بلال المہاجر–ولایہ پاکستان

(ترجمہ)

برما (روہنگیا) کے مسلمانوں کی حالتِ زار پر گفتگو کرتے ہوئے، جو اس ملک کے بدھ مت حکمرانوں کے ہاتھوں مصائب جھیل رہے ہیں، ہم یہ بات اس لیے کر رہے ہیں کہ زبان یا نسل کا کوئی اشتراک نہ ہونے کے باوجود، ہم زمین کے سب سے مضبوط رشتے یعنی اسلام کے بندھن کے ذریعے ان سے جڑے ہوئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ، وَتَرَاحُمِهِمْ، وَتَعَاطُفِهِمْ، مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى»** "اہلِ ایمان کی باہمی محبت، رحمت اور شفقت کی مثال ایک جسم کی مانند ہے؛ جب اس کا کوئی ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم بیداری اور بخار کے ساتھ اس کا ساتھ دیتا ہے"۔

یہ حدیث، جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو زبانی یاد ہے، محض ان کی حالت ہی بیان نہیں کرتی، بلکہ یہ اس امر کا تقاضا بھی کرتی ہے کہ جب کبھی ان میں سے کوئی ایک بھی مصیبت کا شکار ہو تو پوری جماعت کو اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ چنانچہ روہنگیا کا بحران، امت کو درپیش دیگر مصائب کی طرح، امت کے جسم پر ایک زخم کی مانند سمجھا جانا چاہیے، جو ہنگامی حالت کے نفاذ اور ایسی حالت کے تمام تر تقاضوں کو پورا کرنے کا متقاضی ہے۔

روہنگیا عوام کی اکثریت مسلمان ہے اور ان کا تعلق میانمار (جسے پہلے برما کہا جاتا تھا) کی ریاست راکھین سے ہے، جو ماضی میں اراکان کے نام سے جانی جاتی تھی۔ میانمار کی آبادی تقریباً 6 کروڑ ہے، اور عام طور پر پیش کیے جانے والے سرکاری تخمینوں کے مطابق مسلمانوں کی آبادی تقریباً 4 فیصد بتائی جاتی ہے، جو اس کل تعداد کے لحاظ سے تقریباً 24 لاکھ مسلمانوں کے برابر بنتی ہے۔ تاہم، اس خطے میں عمومی طور پر اپنائی جانے والی پالیسیوں کی وجہ سے یہ اعداد و شمار غیر درست یا گمراہ کن ہیں؛ مثال کے طور پر، بھارت میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی آبادی 20 فیصد سے زیادہ نہیں بتائی جاتی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا تناسب 40 فیصد سے زائد ہے، جو کہ میڈیا میں بتائی جانے والی یا ریاست کے سرکاری اعداد و شمار میں درج کی گئی تعداد سے دو گنا ہے۔

فطری طور پر، روہنگیا عوام کی برادری امتِ مسلمہ کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے؛ درحقیقت، ان کی نسلی بنیادوں میں عرب مسلمان اور ہندوستان کے مغل حکمران دونوں شامل ہیں۔ لفظ "روہنگیا" دراصل روہانگ کے باشندوں کو ظاہر کرتا ہے، جو اراکان کا سابقہ اسلامی نام تھا۔ روہنگیا آبادی تاریخی خطے اراکان میں مرکوز ہے، جو جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے سنگم پر واقع ایک قدیم ساحلی ریاست ہے۔ خلیج بنگال پر اپنے ساحلی محلِ وقوع کی بدولت، اراکان نے برما اور بیرونی دنیا کے درمیان بحری تجارت کے ایک اہم مرکز کے طور پر کردار ادا کیا۔ تاریخی اعتبار سے، عرب سرزمین سے آنے والے مسلمان تاجروں نے نویں صدی عیسوی کے اوائل ہی میں اسلام کی رسالت (پیغام) کو اراکان سے متصل جنوب مشرقی بنگال کے ساحلی علاقوں تک پہنچا دیا تھا۔ صدیوں پر محیط اس عرصے میں یہ مسلمان اس بات سے بخوبی باخبر رہے کہ تجارت انہیں اشاعتِ اسلام کے موقع سے غافل نہ کرے، چنانچہ اس کے نتیجے میں بہت سے مشرک بدھ مت والوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ روہنگیا عوام کی تاریخی جڑیں اسی دور سے ملتی ہیں، اور وہ آج کے دن تک اسلام پر پوری ثابت قدمی سے کاربند ہیں۔

روہنگیا کے خلاف بدھ مت والوں کی دشمنی کی اصل جڑ بدطینت برطانوی ہیں؛ جبکہ ایشیا کے عوام عام طور پر امن پسندی اور پرسکون مزاج کے حامل رہے ہیں۔ اسلام نے برصغیر پاک وہند سمیت اس خطے پر صدیوں حکومت کی اور اس دوران فرقہ وارانہ، عقائدی یا مذہبی تقسیم کی بنیاد پر کسی قسم کے انقلابات، بے چینی یا تنازعات نے جنم نہیں لیا۔ تاہم، جب مکار انگریز اس خطے کو نوآبادی بنانے آئے، تو انہوں نے، اپنی پرانی فطرت کے مطابق، قبائلی، نسلی اور مذہبی کشیدگی کو ہوا دی۔ انہوں نے بدھ مت، ہندومت اور سکھ فلسفوں کو مشرکانہ تصوف کی اشکال سے منظم مذاہب میں تبدیل کر دیا، تاکہ وہ مختلف عقائد کے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف دست وگریبان کر سکیں۔ اس سے انگریزوں کے لیے ظلم و جبر اور اپنا تسلط قائم کرنا آسان ہو گیا، جو کہ نوآبادیاتی طاقتوں کا سب سے پسندیدہ حربہ رہا ہے۔ لہٰذا، اس دشمنی کی ایک اور وجہ عقائدی ہے؛ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان کی عکاسی کرتی ہے: ﴿**لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا**﴾ "یقیناً آپ اہلِ ایمان کے ساتھ دشمنی میں سب سے سخت یہود اور ان مشرکین کو پائیں گے جنہوں نے شرک کیا" (سورۃ المائدہ: آیت 82)۔

فطری طور پر، بدھ مت والے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والوں کے اسی زمرے میں آتے ہیں، جیسا کہ انگریز عیسائی بھی اسی میں شامل ہیں، جو اس خطے کے تمام تر دکھ درد اور مصائب کی بنیادی جڑ تھے۔

ہمارے روہنگیا بھائیوں کے موجودہ مصائب کا آغاز 2012 کے اوائل میں ہوا، جب پولیس نے ریاست راکھین میں گشت کرنا شروع کیا۔ بدھ بھکشوؤں نے ایسے رسائل تقسیم کرنا شروع کر دیے جن میں روہنگیا کو دہشت گرد بنا کر پیش کیا گیا تھا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ اپنی "بے قابو" شرحِ پیدائش کے باعث ریاست پر قابض ہو جائیں گے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مرکزی قصبے سیتوے (Sittwe) میں پمفلٹ بھی تقسیم کیے جن میں اعلان کیا گیا کہ: "تمہیں ان لوگوں کو ختم کرنا ہو گا، ورنہ وہ تمہاری زمین پر قبضہ کر لیں گے"۔ نارزی (Narzi) کا علاقہ، جسے سیتوے میں سب سے بڑی مسلم آبادی اور معاشی مرکز ہونے کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا، جہاں تقریباً 10 ہزار روہنگیا آباد تھے، اسے جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ ملبے کے درمیان جو بھی عمارتیں یا ڈھانچے سلامت بچ رہے تھے، انہیں بعد ازاں بلڈوزر چلا کر مسمار کر دیا گیا۔

اکتوبر 2012 میں مقامی حکام اور بدھ بھکشوؤں کی باقاعدہ منصوبہ بندی اور اشتعال انگیزی کے نتیجے میں ظلم و ستم کا یہ سلسلہ ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔ سکیورٹی فورسز یا تو خاموش تماشائی بن کر یہ حملے دیکھتی رہیں یا پھر خود ان میں سرگرمی سے شریک ہو گئیں، جبکہ پولیس نے فرار ہونے والے روہنگیا مسلمانوں پر گولیاں برسا دیں۔ یوں ریاست راکھین میں حکام کی جانب سے چلائی جانے والی نسلی کشی کی مہم مزید مستحکم ہو گئی۔ سیتوے میں، جہاں 2012 سے پہلے لگ بھگ 75 ہزار روہنگیا آباد تھے، وہاں محض 4 ہزار ہی باقی رہ گئے۔ سن 2012 اور 2013 میں وسطی راکھین کیمپوں کے قیام کے بعد، حکام نے روہنگیا کی نقل و حرکت کو محدود کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک پابندیاں مسلط کرنا شروع کر دیں؛ ان اقدامات میں چوکیاں، خاردار تاروں کی باڑیں، کرفیو، پرمٹ کی کڑی شرائط، لازمی پولیس نگرانی، اور روزانہ کی بنیاد پر ہراساں کرنا، دھمکیاں دینا، بھتہ خوری اور رشوت ستانی شامل تھے۔ نسلی کشی کا یہ سلسلہ اگست 2017 کے واقعات تک جاری رہا، جب میانمار کی سکیورٹی فورسز نے سینکڑوں روہنگیا دیہات کو تباہ کر دیا اور شمالی ریاست راکھین میں عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا، جس کے نتیجے میں کم از کم 7 لاکھ افراد بنگلہ دیش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ برمی فوج نے ریاست راکھین کے گاؤں ماؤنگ نو (Maung Nu) میں درجنوں روہنگیا مسلمانوں کو بغیر کسی کارروائی کے سرسری طور پر قتل کر دیا۔

ابھی حال ہی میں، نومبر 2023 کے دوران ریاست راکھین میں میانمار کی فوجی جنتا کی افواج اور اراکان آرمی کے درمیان لڑائی اور جھڑپیں ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔ دونوں فریق سنگین خلاف ورزیوں کے ذمہ دار رہے ہیں، جن میں شہریوں پر جان بوجھ کر حملے، املاک کو نذرِ آتش کرنا اور جبری و غیر قانونی بھرتی شامل ہے۔ ریاست راکھین میں باقی رہ جانے والے تقریباً 6 لاکھ روہنگیا ظلم و ستم اور تشدد کا سامنا کر رہے ہیں؛ وہ نقل و حرکت کی آزادی کے بغیر کیمپوں اور دیہات

تک محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور انہیں خوراک، صحت کی دیکھ بھال، تعلیم اور روزگار تک مناسب رسائی سے محروم کر دیا گیا ہے۔

اگرچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ﴾"اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے" (سورۃ الانفال: آیت 72)، لیکن آج المعتصم، محمد بن قاسم یا اورنگ زیب عالمگیر جیسی کوئی شخصیت موجود نہیں جو روہنگیا کی فریاد کا جواب دے سکے؛ چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے آنے والے مشرک بدھ مت حکمرانوں کے زیرِ تسلط دہائیوں سے امتیازی سلوک اور جبر و ستم سہتے آ رہے ہیں۔ یہ مدد مسلمانوں کے موجودہ حکمرانوں کی طرف سے ہرگز نہیں آئے گی، جیسا کہ فلسطین، مقبوضہ کشمیر، بھارت اور مشرقی ترکستان میں مصائب کا شکار مسلمانوں کی مدد کرنے میں ان کی کھلی ناکامی اس کا واضح ثبوت ہے۔

اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے حکمران، خاص طور پر بنگلہ دیش اور ملائیشیا کے حکمران، ان لوگوں کو ایسے حالات میں رہنے پر مجبور کر کے ان کی تکالیف میں مزید اضافہ کرتے ہیں جو جانوروں کے رہنے کے لائق بھی نہیں ہیں، اور پھر بالآخر انہیں برما میں ان کے ظالموں کے آگے پھینکنے کے لیے واپس بے دخل کر دیتے ہیں۔

حالانکہ بنگلہ دیش، پاکستان، انڈونیشیا اور ملائیشیا کی بحری افواج برما کے مشرک بدھ مت حکمرانوں کو باآسانی شکست دے سکتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے اورنگ زیب کے دور میں بہادر کمانڈروں نے کیا تھا۔ بلاشبہ، امتِ مسلمہ اور اس کی افواج پر لازم ہے کہ وہ ان حکمرانوں کو، جو امت کے اصل دشمن ہیں، اقتدار سے ہٹا دیں اور اسلامی نظامِ حکومت کی حفاظتی ڈھال کو بحال کریں۔

امت کو درپیش مسائل یکساں اور آپس میں جڑے ہوئے ہیں، اور ان کے مصائب بھی تقریباً ایک جیسے ہیں: اراکان کی صورتحال غزہ کی صورتحال کا آئینہ دار ہے، بالکل اسی طرح جیسے کشمیر اور مشرقی ترکستان کی زبوں حالی ہے، اور جو کچھ ماضی میں چیچنیا اور بوسنیا و ہرزیگووینا میں پیش آیا۔ ان تمام تر مصائب کا صرف ایک ہی حل ہے، امت کے مسائل کا ایک بنیادی علاج۔ مسئلے کی اصل جڑ مسلمانوں کے وہ حکمران اور نظام ہیں جنہوں نے امت کا گلا دبوچ رکھا ہے؛ انہیں اقتدار سے اکھاڑ پھینکنا ناگزیر ہے تاکہ ایک ایسے خلیفہ کی تقرری کی راہ ہموار کی جا سکے جو دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کا پرچم بلند کرے اور ان کی نصرت فرمائے۔

ہماری فوج کے کمانڈر دشمن فوج کے کمانڈروں سے ملاقات کیوں کرتے ہیں؟

ذرائع ابلاغ نے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین، کویت، قطر، اردن اور مصر کے عسکری سربراہان کے درمیان امریکی سینٹرل کمانڈ (سینٹ کام) کے کمانڈر ایڈمرل بریڈ کوپر اور یہودی وجود کے چیف آف اسٹاف ایال زمیر کے ساتھ ایک خفیہ، بند کمرہ ملاقات کا انکشاف کیا ہے۔ یہ ملاقات جرمن وزارتِ دفاع کے علم میں لائے بغیر جرمنی میں منعقد ہوئی۔

خبر رساں ویب سائٹ 'ایکسیس' (Axios) کے مطابق ایڈمرل کوپر نے شریک ممالک کو یقین دہانی کرائی کہ خطے میں موجود امریکی فوجی اڈوں کو نشانہ بنانے والے ایرانی حملوں کے باوجود امریکی فوج خطے سے اپنے فوجی واپس نہیں بلائے گی۔ اس کے علاوہ انہوں نے آبنائے ہرمز کے راستے بحری جہازرانی کو وسعت دینے کے امریکی منصوبے پر بھی شرکائے اجلاس کو بریفنگ دی۔

یہودی وجود کے ایک عہدیدار نے بتایا کہ جنرل ایال زمیر نے شرکاء کو مختلف محاذوں پر اپنے وجود کی عسکری کارروائیوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ ادھر امریکی سینٹرل کمانڈ کے جاری کردہ ایک بیان کے مطابق، عسکری رہنماؤں نے مشرقِ وسطیٰ میں سیکیورٹی تعاون کو مستحکم بنانے کے مواقع پر تبادلہ خیال کیا۔

ہمارے عسکری قائدین کے اس گھناؤنے اقدام کے تناظر میں حزب التحریر کے مرکزی میڈیا آفس کی جانب سے جاری کردہ ایک پریس ریلیز میں درج ذیل نکات کی وضاحت کی گئی:

"پہلا یہ کہ امت ان کمانڈروں سے یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اپنے حکمرانوں کی غداری اور امت کے دشمنوں کے ساتھ ان کی ملی بھگت کا تدارک کرنے کے لیے اکٹھے ہوں گے، تاکہ وہ ان حکمرانوں کو معزول کرنے اور مسلمانوں کے ایک واحد خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔ لیکن اس کے برعکس، انہوں نے امت کے خلاف غداری اور سازش میں اپنے ہی حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہودیوں کے چیف آف اسٹاف سے ملاقات کی، جس کے ہاتھ اب بھی فلسطین، لبنان اور شام میں مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ مزید برآں، انہوں نے امریکی سینٹرل کمانڈ کے

سربراہ سے بھی ملاقات کی، جو عراق، افغانستان، یمن اور ایران میں مسلمانوں کے قاتل ہیں۔ اللہ کی قسم، یہ یقیناً ایک انتہائی سنگین اور ہولناک معاملہ ہے!

دوسرا: مسلم ممالک میں امریکہ کے تمام تر اقدامات کا مقصد ان پر اپنا تسلط مضبوط کرنا، ان کے اسٹریٹجک مقامات پر اپنے اثر ورسوخ کو وسعت دینا، اور اپنے روایتی یورپی حریفوں کو وہاں سے بے دخل کرنا ہے۔ اس منصوبے میں وہ ان عسکری رہنماؤں کو اپنی پالیسیوں کے نفاذ کے لیے محض آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ رویبضہ (کمینے اور نااہل حکمرانوں) کے ساتھ کرتا ہے۔

تیسرا: امریکہ کا مقصد خطے کے سیکیورٹی نظام میں یہودی وجود کو ضم کرنا ہے۔ ان رہنماؤں نے یہودی وجود کے چیف آف اسٹاف کی جانب سے اس کے مغرور اور اچھوت وجود کی مختلف محاذوں پر عسکری کارروائیوں کی تفصیلات کو یوں بیٹھ کر سنا گویا یہ کارروائیاں کسی دور دراز سرزمین پر ہو رہی ہوں، نہ کہ ان کے اپنے ہی خطے میں! اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی ذرہ برابر غیرت و شرم باقی ہوتی، تو وہ اس اجلاس میں بیٹھنے پر کبھی رضامند نہ ہوتے، جو امریکہ کے نقطہ نظر سے سیکیورٹی تعاون کو تقویت دیتا ہے۔"

اس پریس ریلیز میں ان عسکری کمانڈروں کو، اور ساتھ ہی بلادِ مسلمین کے دیگر عسکری کمانڈروں اور ان کی حمایت کرنے والوں یا ان کے اقدامات پر خاموش رہنے والوں کو بھی، خبردار کرتے ہوئے اعلان کیا گیا: "حزب التحریر کا مرکزی میڈیا آفس ان رہنماؤں، بلادِ مسلمین کے تمام عسکری سربراہان، امت کے دشمنوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف سازش کرنے اور اس کی غداری میں شریک ہونے والوں، اور رویبضہ کی خیانت پر خاموش تماشائی بنے رہنے والے تمام افراد کو دنیا اور آخرت میں ان کی غداریوں کے بھیانک انجام سے خبردار کرتا ہے۔ لہٰذا اے عسکری قائدین! اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں، امت کی صفوں میں لوٹنے کی جلدی کریں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حضور توبہ کریں، اور ان رویبضہ کو معزول کرنے اور ایک واحد خلیفہ کی بیعت کرنے کے لیے فوری طور پر اکٹھے ہوں جو نبوت کے نقشِ قدم پر خلافتِ راشدہ کے تحت امت کو متحد کرے۔"

پریس ریلیز کے اختتام پر کہا گیا: "حزب التحریر، وہ رہنما جو اپنے لوگوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا، امت کے ہر مخلص فرد اور اس کے رہنماؤں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت کے قیام میں اس کا ساتھ دیا جائے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی عزت اور اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی خوشنودی مضمر ہے۔"

یمن کے لیے استعماری طاقتوں کے قدم جمانے والے آلات سے چھٹکارا پانے کے سوا کوئی نجات نہیں

"ہم یمن میں اینگلو-امریکن (برطانوی و امریکی) تنازع کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہیں، لیکن یہ تنازع علاقائی اور مقامی گماشتوں (پراکسیز) کے ذریعے لڑا جا رہا ہے۔ وہاں کے عوام اس تنازع کا ایندھن بنے ہوئے ہیں اور دہائیوں سے شدید مصائب جھیل رہے ہیں۔ ان گماشتوں کو عوام کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ وہ اپنے ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ، یمن کی نجات محض ان آلات و مہروں کو ختم کرنے میں ہے جو باہم برسرِپیکار استعماری طاقتوں کو اپنی موجودگی برقرار رکھنے اور اپنے اثر و رسوخ کو پھیلانے کے قابل بناتے ہیں۔ یہ مقصد صرف نبوت کے نقشِ قدم پر خلافتِ راشدہ کے قیام کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، جس کا وعدہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ﴾"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے کہ وہ انہیں زمین میں ضرور جانشینی (خلافت) عطا فرمائے گا"[سورۃ النور: آیت 55]۔ اور یہ رسول اللہ ﷺ کی نویدِ جاں فزا تھی:«ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ» "پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت ہوگی۔" (اسے احمد، طیالسی اور بزار نے روایت کیا ہے)۔ لہٰذا، ہم اہلِ یمن سے اپیل کرتے ہیں جن کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما کر کی تھی:«الْإِيمَانُ يَمَانٍ هَا هُنَا» "ایمان تو یمنی ہے، وہ یہاں ہے۔" (اسے بخاری نے روایت کیا ہے)۔ اور آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:«الْفِقْهُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ» "دین کی سمجھ (فقہ) یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے۔" (اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے)۔

ہم ان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ حزب التحریر کی نصرت و حمایت کریں تاکہ ہم سب مل کر اللہ القوی العزیز کے وعدے اور اس کے رسول ﷺ کی خوشخبری کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کریں، جس سے ہم دونوں جہانوں میں سرخرو ہو سکیں، اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

امیر حزب التحریر، جلیل القدر عالم عطا ابن خلیل ابو الرشتہ کے جاری کردہ سوال کے جواب سے ایک اقتباس

ایک اور "5+1" سربراہی اجلاس

تحریر: استاد ہارون عبد الحق

(ترجمہ)

حالیہ دنوں میں، وسطی ایشیائی ریاستوں کے ساتھ باہمی تعاون کی عکاسی کرنے والے "5+1" فارمیٹ کے سربراہی اجلاسوں کا دائرہ کار تیزی سے وسیع ہو رہا ہے۔ اس رجحان کے پیچھے اہم عالمی واقعات، جغرافیائی و سیاسی تبدیلیاں، خونی تنازعات، معاشی جنگیں، پابندیاں اور اہم تجارتی راستوں کی بندش جیسے اسباب کارفرما ہیں۔ یہ وہ تمام عوامل ہیں جنہوں نے وسطی ایشیا کی اسٹریٹجک اہمیت کو غیر معمولی حد تک بڑھا دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ خطہ اشیاء کی برآمدات کے لیے ایک بڑی منڈی اور قدرتی وسائل، خصوصاً نایاب معدنیات کے ایک اہم منبع، دونوں حیثیتوں سے نمایاں حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ، اسی صورتحال کے پیشِ نظر "5+1" سربراہی اجلاسوں کو اب سربراہانِ مملکت کی سطح تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اس طرح کے اجلاس ہر ملک سے فرداً فرداً بات چیت کرنے کے بجائے، خطے کی تمام ریاستوں کے ساتھ بیک وقت باہمی تعاون کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

اسی پس منظر میں، جنوبی کوریا نے بھی وسطی ایشیائی ریاستوں کے ساتھ اپنے باہمی تعاون کو ایک نئی سطح پر استوار کر لیا ہے۔ 16 ستمبر کو سیول میں ایک سربراہی اجلاس منعقد ہوا جس میں جنوبی کوریا کے صدر اور وسطی ایشیا کے پانچوں ممالک—کرغزستان، قازقستان، ازبکستان، ترکمانستان اور تاجکستان—کے قائدین شریک ہوئے۔ اس پیش رفت نے "5+1" سربراہی اجلاسوں کے سلسلے میں ایک نئی کڑی کا اضافہ کیا اور اس کا اختتام تین روز پر محیط دوطرفہ ملاقاتوں کے سلسلے کے ساتھ ہوا۔ ان کارروائیوں کے دوران توانائی، کان کنی، بنیادی ڈھانچے (انفراسٹرکچر)، ٹیکنالوجی اور سرمایہ کاری جیسے شعبوں میں 70 سے زائد معاہدوں اور مفاہمت کی یادداشتوں پر دستخط کیے گئے۔

بنیادی طور پر، یہ تعاون کوئی نئی پیش رفت نہیں ہے۔ کوریا-وسطی ایشیا تعاون فورم 2007 میں قائم ہوا تھا؛ ابتدا میں یہ نائب وزرائے خارجہ کی سطح پر منعقد ہوتا تھا، جسے بعد میں وزارتی سطح تک اپ گریڈ کر دیا گیا۔ تاہم، سربراہانِ مملکت کی سطح پر اس نوعیت کا سربراہی اجلاس اس سے قبل کبھی منعقد نہیں ہوا تھا۔

متعدد عوامل جنوبی کوریا کو اس باہمی تعاون کو اس بلند سطح پر لانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان میں سرِفہرست قدرتی وسائل ہیں؛ چونکہ ملک کے اپنے گھریلو وسائل انتہائی محدود ہیں، اس لیے وہ درآمدات پر انحصار کرتا ہے۔ عالمی جغرافیائی و سیاسی تبدیلیاں اور تنازعات ان وسائل کی ترسیلی زنجیروں (سپلائی چینز) کو متاثر کرتے ہیں، جس سے کئی خطرات اور خدشات جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ قدرتی وسائل سے محروم یہ ملک تیل، یورینیم اور دیگر اسٹریٹیجک طور پر اہم معدنیات کے ذرائع میں تنوع پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔

اس شعبے میں ایک اور تشویشناک پہلو چین کا کردار اور پوزیشن ہے۔ چین کی برتری محض معدنیات نکالنے تک محدود نہیں ہے، بلکہ نایاب معدنیات کی پروسیسنگ اور ان سے حاصل ہونے والی جدید ترین ہائی ٹیک مصنوعات کی تیاری تک پھیلی ہوئی ہے۔ فی الوقت دنیا بھر میں دریافت شدہ نایاب معدنیات کے تقریباً 38 سے 44 فیصد ذخائر چین کے پاس ہیں —جن کی مقدار لگ بھگ 4 کروڑ 40 لاکھ (44 ملین) ٹن بنتی ہے—اور وہ سالانہ عالمی پیداوار کے تقریباً 60 سے 70 فیصد کا احاطہ کرتا ہے۔ خام مال کی پروسیسنگ اور ریفائننگ کے میدان میں اس کی پوزیشن اور بھی زیادہ مضبوط ہے، جہاں نایاب معدنیات کی پروسیسنگ کی عالمی مارکیٹ کے 90 فیصد حصے پر اسی کا کنٹرول ہے۔

یہ صورتحال جنوبی کوریا سمیت دیگر اقوام کو چینی ٹیکنالوجی پر منحصر کر دیتی ہے—اور یہ ایک ایسا مؤثر حربہ ہے جسے چین اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے اثر و رسوخ قائم کرنے کی خاطر استعمال کر سکتا ہے۔

اس کی ایک عملی مثال دیکھی جا سکتی ہے: چنانچہ چین کے حریف ملک جاپان کو ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا؛ جب 2026 میں چین نے نایاب زمینی معدنیات کے سلسلے میں اس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ تائیوان کے معاملے پر جاپان کا مؤقف، خاص طور پر اپنے دفاعی شعبے کو مضبوط بنانے کی اس کی کوششیں، ان محرکات میں شامل تھیں جنہوں نے چین کو یہ پابندیاں عائد کرنے پر اکسایا۔

نتیجتاً، سیول نے نایاب زمینی معدنیات سے متعلق چینی دباؤ کے سامنے جھکنے سے بچنے کے لیے متبادل ذرائع کی تلاش کو اولین ترجیح دینا شروع کر دیا ہے—خاص طور پر چین اور امریکہ کے درمیان جاری معاشی جنگ کے تناظر میں۔ امریکی دائرہ اثر میں جنوبی کوریا کی موجودگی کے باعث یہ خطرات مزید سنگین ہو جاتے ہیں۔

مزید یہ کہ یوکرین میں جنگ چھڑنے کے بعد سے وسطی ایشیا میں روس کا اثر ورسوخ زوال پذیر ہے، کیونکہ وہ فی الوقت اپنی توجہ، وسائل اور وقت کا بڑا حصہ اس تصادم پر مرکوز کیے ہوئے ہے۔ اس جنگ اور اس سے جڑی پابندیوں نے روس کی معیشت کو کمزور کر دیا ہے، جس کے باعث خطے میں اس کا اثر ورسوخ سکڑ کر رہ گیا ہے۔

اس کے جواب میں، مغربی ممالک اور ان کے اتحادی اس کوشش میں ہیں کہ طاقت کے اس پیدا ہونے والے خلا پر چین —یا کسی بھی دوسری ریاست— کو اجارہ داری قائم کرنے سے روکا جائے، اور ساتھ ہی وہ روسی اثر ورسوخ کو مزید محدود کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "5+1" فارمیٹ میں منعقد ہونے والے سربراہی اجلاس انہی مقاصد کے حصول کی حکمتِ عملی کا حصہ ہیں۔

لہٰذا، اس نوعیت کے سربراہی اجلاسوں کو محض معاشی زاویے سے دیکھنا درست نہیں ہوگا؛ بلکہ ان کے پسِ پردہ جغرافیائی وسیاسی مقاصد کارفرما ہیں جن کا رشتہ بالآخر مغرب سے جا جڑتا ہے۔

خطے میں تاریخی طور پر غالب قوت کے حامل روس کی کمزوری کے پیشِ نظر، وسطی ایشیائی ریاستیں ایک کثیر جہتی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے کے لیے ایسے سربراہی اجلاسوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے بے چین ہیں۔ وہ اپنے وسائل کے عوض ٹیکنالوجی اور سرمایہ کاری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی امید رکھتی ہیں۔ خاص طور پر قازقستان اور ازبکستان صرف روس یا چین پر انحصار ختم کرنے کی سمت میں کام کر رہے ہیں اور دیگر ممالک کے ساتھ بھی اپنے تعاون کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وسطی ایشیائی ریاستیں تمام "5+1" سربراہی اجلاسوں میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

تاہم، مروجہ سرمایہ دارانہ نظام کے زیرِ سایہ ایک واقعی خود مختار اور آزادانہ پالیسی پر چلنا ناممکن ہے۔ ایک استعمار کی گرفت سے بچ نکلنے کا نتیجہ اکثر دوسرے کے شکنجے میں جا پھنسنے کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، آپ خود پر اثر انداز ہونے والی قوت کی مصنوعات کے لیے اپنی مارکیٹیں کھول دیتے ہیں، اور عملاً اپنی معدنی دولت اپنے ہی ہاتھوں سے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔

استعمار اپنے اثر ورسوخ کو وسعت دینے کے لیے ان سربراہی اجلاسوں کا استحصال کرتے ہیں، اور بعض اوقات جنگ کے ذریعے اسے براہِ راست مسلط کر دیتے ہیں۔ یوں استعمار کی حرص ولالچ پر مبنی پالیسیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں جنگیں اور تنازعات پھوٹ پڑتے ہیں، جن کی قیمت عام انسانوں کو چکانی پڑتی ہے۔

چنانچہ حقیقی آزادی اور ترقی کا حصول مسلم سرزمینوں کے باہمی وحدت کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر الگ الگ ریاستیں منتشر رہیں—تنگ نظر قوم پرستی سے وابستہ رہیں اور صرف اپنے ہی مفادات کو ترجیح دیتی رہیں—تو وہ بدستور استعمار کا شکار بنتی رہیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم پرستی وحدت کی طرف جانے والی بدترین راہوں میں سے ایک ہے؛ بلکہ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو وحدت کی راہ میں واضح رکاوٹ ہے۔ حقیقی اور مکمل یکجہتی صرف اور صرف ایک درست اور جامع آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہی حاصل کی جاسکتی ہے: اور وہ اسلام کی عظیم آئیڈیالوجی ہے۔

روس کے خلاف سیکیورٹی صف بندی اور یورپی جنگی بیانیے میں بڑھتی ہوئی شدت کے پس پردہ عوامل کا تجزیہ

تحریر: استاد مناجی محمد

(ترجمہ)

حکمتِ عملی کے اعتبار سے روس اور یوکرین کا تنازع بڑی طاقتوں کے مابین ایک بڑی جنگ کی صورت اختیار کر چکا ہے، جس میں روس براہِ راست فریق ہے، جبکہ امریکہ اور یورپ پسِ پردہ کارفرما ہیں اور یوکرین جنگ کے میدان کا کردار ادا کر رہا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ عالمی منظرنامے پر اس جنگ کے اسٹریٹیجک اثرات انتہائی نازک اور گہرے ہیں۔

امریکہ کا اصل مقصد روس کو ایک دلدل میں پھنسانا ہے تاکہ چین اور روس کے ممکنہ اتحاد کا راستہ روکا جا سکے اور ساتھ ہی روس کی عسکری طاقت کو مفلوج کر دیا جائے۔ مزید برآں، واشنگٹن کا مقصد اس تنازع کو یورپ کا سب سے بڑا دردِ سر بنانا ہے تاکہ اس پورے براعظم کو بین الاقوامی منظرنامے سے الگ تھلگ کیا جا سکے۔ امریکہ نے اس جنگ کے دائرہ کار اور شدت کو مخصوص حدود کے اندر قابو میں رکھنے کی کوشش کی ہے، تاکہ تنازع اس حد کو پار نہ کرے جہاں وہ ایک ہمہ گیر جنگ میں تبدیل ہو جائے جس میں نیٹو اور خود امریکہ براہِ راست الجھ جائیں۔

دوسری جانب برطانیہ اس جنگ کو اپنے استعماری عزائم کی تکمیل، بین الاقوامی صف بندیوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے اور عالمی منظرنامے کو از سرِ نو تشکیل دینے کا ایک سنہری موقع سمجھتا ہے۔ یوکرین کی حمایت میں اس کی "زہر آلود فیاضی" کا مقصد اس تنازع کو ایک بڑی بین الاقوامی جنگ کے دہانے تک دھکیلنا ہے، جس کے پیچھے یہ امید کارفرما ہے کہ عالمی نظام اور طاقت کے توازن کو بدل کر وہ اپنا کھویا ہوا استعماری اثر و رسوخ دوبارہ حاصل کر لے گا۔

جہاں تک یورپ کا تعلق ہے، جو اس وقت دفاعی تیاریوں اور بڑھتی ہوئی جنگی بیان بازی کی کیفیت میں ہے، تو بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ روس کے خلاف ایک فوری جنگ اور ہمہ گیر جارحیت کی تیاری کر رہا ہے۔ یہ صورتحال اس امر کی متقاضی ہے کہ یورپی منظرنامے اور اس کے رکن ممالک، بالخصوص جرمنی، فرانس اور اٹلی جیسے اہم فریقین کے اسٹریٹیجک اور عسکری مؤقف کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے۔ روس-یوکرین تنازع کے حوالے سے بڑھتے ہوئے جنگی

بیانیے اور شدید انتباہات کے باوجود، خاص طور پر جب اس جنگ کو محض یوکرین کے تنازع کے بجائے پورے یورپ کا سیکیورٹی بحران اور گزشتہ کئی دہائیوں میں یورپی سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا جا رہا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ نیٹو اور یورپ کے خلاف روسی فضائی حدود کی خلاف ورزیوں، تخریب کاریوں، سائبر حملوں اور ہائبرڈ سرگرمیوں میں اضافہ بھی دیکھا جا رہا ہے، یورپ کا یہ جنگی بیانیہ کتنا ہی شدید اور تند و تیز کیوں نہ ہو، اپنے پسِ پردہ اصل محرکات، اسباب اور اہداف کو چھپائے ہوئے ہے۔

اگرچہ یوکرین کے خلاف روس کی جنگ بلاشبہ یورپ کے لیے ایک سیکیورٹی خطرہ ہے، تاہم روس خود اس تنازع میں بری طرح الجھا ہوا ہے؛ روسی وزیرِ خارجہ لاوروف مسلسل اور واضح طور پر یہ کہتے رہے ہیں کہ روس یورپ کے ساتھ جنگ کا خواہاں نہیں ہے۔ 27 ستمبر 2025 کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا تھا کہ روس کا "نیٹو یا یورپی یونین پر حملہ کرنے کا نہ کوئی ارادہ تھا اور نہ ہی کوئی ارادہ ہے"، اور ساتھ ہی انہوں نے واضح کیا کہ پیوٹن بارہا ایسے الزامات کی تردید کر چکے ہیں۔ بعد ازاں، 9 فروری 2026 کو لاوروف نے دوٹوک انداز میں کہا: "ہم یورپ کے کسی بھی حصے پر حملہ نہیں کریں گے؛ ہمارے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے"۔ پھر 16 ستمبر 2026 کو یکاترنبرگ میں انہوں نے اپنے مؤقف کو دہراتے ہوئے کہا کہ روس "مغربی ممالک پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی مفاد ہے"، اور یہ وہ مؤقف ہے جس کی ماسکو مسلسل توثیق کرتا رہا ہے۔ مزید یہ کہ روسی ہائبرڈ سرگرمیوں میں اضافہ، بالخصوص روس سے متصل یورپی خطے میں، دفاعی نوعیت کا حامل ہے اور یوکرین کے لیے یورپ کی بڑھتی ہوئی حمایت پر ردِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے، نہ کہ یہ یورپی ریاستوں کے خلاف کوئی پیش قدمی یا جارحیت ہے۔ اس کے علاوہ خود یورپی رپورٹس اور انٹیلی جنس جائزے بھی اس تصور کی نفی کرتے ہیں کہ یورپ کی یہ عسکری صف بندی یورپ اور روس کے مابین کسی ناگزیر یا فوری جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ سرکاری اور ادارہ جاتی یورپی رپورٹس موجودہ دہائی کے اختتام، یعنی بالخصوص 2029 سے 2030 کے درمیانی عرصے، کو ایک ایسا نازک موڑ قرار دیتی ہیں جب روس کے پاس نیٹو کے کسی رکن ملک کے لیے خطرہ بننے کی ممکنہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ رپورٹس اس بات کی نشاندہی نہیں کرتیں کہ روس 2030 میں یورپ پر کوئی فوجی حملہ کر دے گا؛ بلکہ وہ بنیادی طور پر اس امر پر بحث کرتی ہیں کہ روسی عسکری صلاحیتیں ایک فیصلہ کن حد تک پہنچ جائیں گی یا اس کے پاس جنگ چھیڑنے کا ایک متبادل آپشن حاصل ہو جائے گا۔ حقیقت میں یہ رپورٹس روسی عسکری طاقت کی مستقبل کی صورتحال کا تجزیہ ہیں، نہ کہ کسی فوری جنگ کے چھڑنے کی پیشین گوئی۔

یہ صورتحال سب سے اہم سوال کو جنم دیتی ہے: یورپ میں موجودہ سیکیورٹی صف بندی اور بڑھتی ہوئی جنگی بیان بازی کے پسِ پردہ اصل حقیقت کیا ہے؟

اس کا جواب یورپ سے باہر جنم لینے والے ایک ایسے عنصر میں پنہاں ہے جو یورپی اسٹریٹیجک سلامتی کے لیے غیر معمولی اہمیت اور سنگین خطرے کا حامل ہے، اور وہ ہے: ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ خاص طور پر ”ٹرمپ کا صدمہ“ (Trump shock)، یعنی امریکی سیکیورٹی چھتری کا واپس کھینچی جانا، نیٹو کے وعدوں سے انحراف، اور مالی و عسکری بوجھ یورپ کے کندھوں پر ڈال دینا، یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کا مشاہدہ یورپ نے یوکرین کی جنگ کے دوران خود اپنی آنکھوں سے کیا۔

امریکہ پر انحصار کے حوالے سے اس صدمے میں اس وقت مزید شدت آگئی جب امریکی ہتھیاروں پر یورپ کے حد سے زیادہ انحصار کا پردہ چاک ہوا؛ یہ عسکری انحصار اس سطح تک جا پہنچا تھا جہاں یورپ کی اسلحہ جاتی درآمدات کا 64 فیصد حصہ، بالخصوص ہوابازی (ایوی ایشن) کے شعبے میں، امریکہ سے آتا تھا۔

اس بڑھتی ہوئی جنگی بیان بازی کے پسِ پردہ دراصل امریکی حفاظتی چھتری کے کھو جانے کا صدمہ اور امریکی اسلحے پر انحصار کا وہ بحران چھپا ہوا ہے جس کی ترسیل امریکی حکومتوں کی غیر یقینی تبدیلیوں اور گہری اندرونی سیاسی تقسیم کی وجہ سے شکوک و شبہات کا شکار ہو چکی ہے؛ اس کے یورپ پر مرتب ہونے والے اثرات نے یورپ کی اپنی اسٹریٹیجک اور عسکری کمزوریوں کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔

اس یورپی جنگی بیانیے کا بنیادی مقصد اور اصل ہدف یورپ کی خودمختار عسکری، صنعتی اور تکنیکی صلاحیتوں کی از سرِ نو تعمیر ہے۔ اس عمل کے لیے خطیر اور بھاری اخراجات درکار ہیں جو معاشرے پر زبردست بوجھ ڈالتے ہیں، اور یہ سب کچھ ایک دم گھونٹ دینے والے معاشی بحران، یورپ کے استعماری اثر و رسوخ کے دائرے میں کمی، گھٹتی ہوئی آمدنی اور بڑھتی ہوئی عوامی بے چینی کے ماحول میں ہو رہا ہے۔

یورپ اب یوکرین پر روس کی جنگ کو اپنی عسکری صنعت کی تعمیرِ نو، مینوفیکچرنگ اور ٹیکنالوجی کے شعبوں کو ترقی دینے اور اس کے بھاری اخراجات کا بوجھ معاشرے پر ڈالنے کے لیے ایک تاریخی موقع سمجھنے لگا ہے، اور اس سارے عمل کا جواز روس کی جانب سے یورپ کو لاحق وجودی سیکیورٹی خطرے کو قرار دیا جا رہا ہے۔

نتیجتاً، یورپ کے دفاعی اخراجات میں غیر معمولی تیزی سے اضافہ ہوا ہے؛ نیٹو کے یورپی ارکان اور کینیڈا کے بنیادی دفاعی اخراجات میں صرف سال 2025 کے دوران ہی تقریباً 20 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ اگرچہ روس کی طرف سے لاحق

خطرہ حقیقی ہے، تاہم یورپ کی از سرِ نو مسلح ہونے کی یہ مہم ان اسٹریٹیجک، عسکری، صنعتی، سیاسی اور معاشی محرکات کے تحت بھی چلائی جا رہی ہے جو براہِ راست روسی خطرے کی شدت سے قطع نظر اپنی الگ حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد "چین کا عنصر" سامنے آتا ہے، بالخصوص جس طرح چینی صنعت اور ٹیکنالوجی نے یورپ میں یلغار کی ہے، جس نے عملاً یورپ کو ایک چینی منڈی میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ چین کی معاشی پیش قدمی نے، جسے اس کی ضرورت سے زیادہ صنعتی پیداواری صلاحیت نے تقویت بخشی ہے، یورپ کے تجارتی خسارے کو سالانہ 360 ارب یورو تک پہنچا دیا ہے، جو کل یورپی درآمدات کا 22.3 فیصد بنتا ہے۔ اس صورتحال نے یورپ کے صنعتی اور تکنیکی بحران کو مزید گہرا کر دیا ہے، کیونکہ چین نے برقی گاڑیوں (EVs)، بیٹریوں، الیکٹرانکس، سافٹ ویئر، عمومی ٹیکنالوجی اور ماحول دوست توانائی (گرین انرجی) جیسے شعبوں میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ صرف 2026 کی دوسری سہ ماہی میں، چین سے یورپی یونین کی درآمدات 153.6 ارب یورو تک پہنچ گئیں، جو کہ اس بلاک کے باہر سے ہونے والی درآمدات کا 21.9 فیصد ہیں۔ چین کے حوالے سے یورپ کا بحران اس وقت اور زیادہ سنگین ہو گیا جب چین کو برآمدات میں کمی اور وہاں سے درآمدات میں اضافے کے باعث یورپ کی صنعتی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں اور اس کے اہم صنعتی شعبوں کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کی ایک نمایاں مثال جرمنی کی انتہائی اہم آٹوموٹو (گاڑیوں کی) صنعت کو درپیش شدید بحران ہے: صرف جولائی 2026 میں جرمن گاڑیوں کی پیداوار میں 9.2 فیصد کمی واقع ہوئی، جبکہ اس شعبے میں 2025 کے اختتام تک ایک لاکھ نو ہزار (109,000) سے زائد ملازمتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس صورتحال نے یورپی کمیشن کو مجبور کر دیا کہ وہ ان عدم توازنات کو دور کرنے اور یورپی یونین اور چین کے تعلقات میں باہمی برابری (reciprocity) کو یقینی بنانے کے حوالے سے کھل کر آواز اٹھائے۔

ان عدم توازنات کی بنیادی وجہ یورپی صنعتوں کا زوال اور پسماندگی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ برقی موٹروں، چپس اور سافٹ ویئر جیسی ٹیکنالوجیز میں جدت اور ترقی کا سست روی کا شکار ہونا ہے۔ یورپی یونین اور اس کی اہم ترین ریاستیں اپنی معیشتوں کی بحالی اور اپنے صنعتی و تکنیکی بنیادی ڈھانچے کی ترقی کو انتہائی اسٹریٹیجک ضرورت قرار دیتی ہیں، جو چینی پیش قدمی کا مقابلہ کرنے اور امریکہ پر عسکری و تکنیکی انحصار کو کم کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ دفاعی صنعت اس کوشش کے لیے ایک بنیادی انجن کا کام دیتی ہے، جو یورپی صنعت اور ٹیکنالوجی کو آگے بڑھانے کے لیے ایک بنیادی تجربہ گاہ اور ورکشاپ کی حیثیت رکھتی ہے۔

درحقیقت، "چین کا عنصر"، اور اس سے پیدا ہونے والے چیلنجز، اس صف بندی اور یورپ کی عسکری، صنعتی اور تکنیکی صلاحیتوں کی تعمیر و ترقی کے حق میں اٹھنے والے تند و تیز بیانیے کے پیچھے ایک بنیادی محرک ہیں۔

تاہم، بیانیہ بہرحال بیانیہ ہی رہتا ہے، یعنی محض زبانی جمع خرچ۔ اصل چیلنج عملی اقدامات اور ایک منتشر و منقسم یورپ کی تلخ حقیقت کی عائد کردہ رکاوٹوں میں مضمر ہے: اس کے متضاد اور باہم دست و گریبان اسٹریٹیجک اور استعماری عزائم، اس کی بکھری ہوئی کوششیں، اس کے فلک بوس قرضے، اور ان سب سے بڑھ کر، اس کا فکری و تہذیبی دیوالیہ پن۔ یہ وہ پیچیدہ گرہ ہے جسے کھولنا یورپ، اور مجموعی طور پر پورے مغرب، کے لیے اگر ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہے۔ یہ درحقیقت مغرب کے نزع کا عالم اور سکرات کی کیفیت ہے؛ کوئی تعویذ یا تدبیر اس حتمی انجام کو ٹال نہیں سکتی۔

فلسطین کی نصرت کا راستہ معلوم ہے، نامعلوم نہیں

فلسطین کی نصرت و مدد کا راستہ نامعلوم نہیں ہے؛ ہر کوئی جانتا ہے کہ اسے مکمل طور پر آزاد کرانے کے لیے مسلم افواج کی متحرک روانگی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «**لَتُقَاتِلُنَّ الْيَهُودَ فَلَتَقْتُلُنَّهُمْ حَتَّى يَقُولَ الْحَجَرُ: يَا مُسْلِمُ، هَذَا يَهُودِيٌّ فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ**» "تم ضرور یہودیوں سے جنگ کروگے اور انہیں قتل کروگے، یہاں تک کہ پتھر بھی بول اٹھے گا: 'اے مسلم! یہ یہودی میرے پیچھے ہے، آؤ اور اسے قتل کر دو۔'"

اس کے باوجود مسلمانوں کے حکمران استعمار کے مجوزہ حل اور سازشوں کا راگ الاپ رہے ہیں اور حقیقی معنوں میں مؤثر اور عملی اقدامات سے آنکھیں چرائے ہوئے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ**﴾ "اور کہہ دیجیے کہ عمل کرو، پس اللہ تمہارے عمل کو دیکھے گا اور اس کا رسول اور اہلِ ایمان بھی، اور تم غیب اور ظاہر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے" [سورۃ التوبہ: آیت 105]۔

یہ حقیقت کہ یہ حکمران یہودی وجود کے جرائم اور اقوامِ متحدہ کی ناکامی سے بخوبی واقف ہیں، انہیں امت کے مفادات کا دفاع کرنے والے ہیرو نہیں بناتی؛ بلکہ یہ تو استعماری کافروں کے ساتھ ان کی گٹھ جوڑ کی گواہی دیتی ہے، کیونکہ وہ سچائی کو جاننے کے باوجود فلسطین اور اس کے مظلوم عوام کی مدد کے لیے ایک انگلی تک نہیں ہلاتے۔ تمام تر امیدیں اور توقعات امت کی افواج کے ان مخلص عناصر سے وابستہ ہیں جو امت اور اس کے مسائل، بالخصوص فلسطین اور دیگر مقبوضہ مسلم علاقوں کی آزادی، کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں اور ان سازشی کٹھ پتلی حکمرانوں کو نظر انداز کر دیں۔ پس اے مسلمانوں کی افواج، آگے بڑھو اور تیزی دکھاؤ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿**وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ**﴾ "اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف تیزی سے لپکو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے" [سورۃ آل عمران: آیت 133]۔

اردن-فرانس دفاعی تعاون کا معاہدہ: اردنی افواج کو استعماری تنازعے میں جھونکنے کی کوشش

تحریر: ڈاکٹر خالد الحکیم

(ترجمہ)

جمعرات، 17 ستمبر 2026 کو پیرس کے تاریخی مقام 'لیس انویلیڈز' (Les Invalides) میں فرانسیسی صدر ایمانوئل میکرون کے ساتھ مذاکرات کے بعد، شاہ عبداللہ دوم نے اردن اور فرانس کے درمیان دفاعی تعاون کے ایک معاہدے پر دستخط کا اعلان کیا۔ اس معاہدے کا بنیادی مقصد دونوں ممالک کے مابین دفاعی شراکت داری کو مزید گہرا اور مستحکم بنانا ہے۔ تاہم، سماجی رابطے کے پلیٹ فارم 'ایکس' (سابقہ ٹوئٹر) پر شاہ عبداللہ کے جاری کردہ بیان میں اس معاہدے کی مخصوص شرائط یا اس کے حقیقی دائرہ کار کی تفصیلات ظاہر نہیں کی گئیں۔ اس قسم کی پردہ پوشی عموماً اس وقت کی جاتی ہے جب عسکری معاہدات میں ایسی حساس شقیں شامل ہوں جن سے اندرونِ ملک شدید عوامی ردعمل پیدا ہونے یا خطے میں اثر و رسوخ اور بالادستی کے لیے برسرِ پیکار بین الاقوامی حریفوں کے چوکنا ہونے کا خدشہ ہو، بالخصوص جب خطے میں اس نوعیت کے دفاعی معاہدوں کی مسلسل بھرمار ہو رہی ہو۔

اس معاہدے پر دستخط کے علاوہ، اردن کے شاہ اور فرانسیسی صدر نے لبنانی فوج کے کمانڈر جنرل جوزف عون سے بھی ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران، انہوں نے لبنانی فوج کی اعانت کے راستے تلاش کرنے کے لیے "عقبہ پروسیس" (Aqaba Process) کے تحت ایک نئے مشاورتی دور کے انعقاد کی اہمیت پر زور دیا۔ اس بات چیت میں فرانس کی پشت پناہی کے ساتھ اردن کے اس ممکنہ کردار کا بھی باضابطہ اعتراف کیا گیا کہ اگر اقوامِ متحدہ کی امن فوج 'یونیفیل' (UNIFIL) کے مینڈیٹ میں توسیع نہ کی گئی تو اردن اس کے متبادل کے طور پر فرائض انجام دے سکتا ہے۔

بہر حال، شاہ اردن کے دورے کے اختتام پر جاری ہونے والے مشترکہ سرکاری اعلامیے میں ان باضابطہ موقفوں اور عمومی خدوخال کی نشاندہی کی گئی جو اس معاہدے کی بنیاد بنے ہیں، اور یہ معاہدہ دفاع، سلامتی اور علاقائی امور کے شعبوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اعلامیے کے نمایاں نکات درج ذیل ہیں:

- فرانس اور اردن کے درمیان دفاعی و سلامتی کی شراکت داری کی اہمیت، اور اردن کے امن و استحکام کی حمایت کے لیے فرانس کے عزم کا اعادہ۔
- باضابطہ دفاعی تعاون کے معاہدے پر دستخط، جو اپنی دفاعی شراکت داری کو مزید گہرا کرنے کے لیے دونوں ریاستوں کے پختہ عزم کی عکاسی کرتا ہے۔
- دو ریاستی حل کی بنیاد پر مشرقی یروشلم (القدس) کو دارالحکومت بنا کر ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے عملی اقدامات اٹھانا؛ مغربی کنارے کے الحاق کی کسی بھی کوشش یا فلسطینی عوام کو بے دخل کرنے کی کسی بھی (اسرائیلی) کوشش کو دوٹوک مسترد کرنا؛ اور غیر قانونی E1 بستیوں کے توسیعی منصوبے کی مذمت کا اعادہ۔
- شام کے اتحاد، سلامتی، استحکام اور خود مختاری کی غیر مشروط حمایت؛ شام پر جاری "اسرائیلی" حملوں کو فوری روکنے اور 1974 کے افواج کی علیحدگی کے معاہدے (Disengagement of Forces Agreement) کا مکمل احترام کرنے کی ضرورت پر زور۔

اردنی حکومت حالیہ عرصے میں شدید سیاسی مضمرات اور ان سنگین چیلنجوں کے گہرے خوف میں مبتلا ہے جنہوں نے اسے خطے میں جاری کشمکش کے عین دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، ایسی کشمکش جو علاقائی سمجھوتوں اور معرکہ آرائیوں کے دوران خود اس کی بقا کے لیے بھی خطرہ بن سکتی ہے۔ یہ حکومت ایران، امریکہ اور یہودی وجود کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی میں فریق بننے اور امریکہ اور اردن کے مشترکہ دفاعی معاہدے کے تحت امریکی فوجی اڈوں کی میزبانی کرنے کے سبب ان پیچیدہ حالات کی لپیٹ میں آ چکی ہے۔ تاریخی تعلقات اور مسلسل باہمی عسکری و سلامتی کے تحفظ کے باوجود، اردنی حکومت خود کو یہودی وجود کی جانب سے شدید غیر محفوظ محسوس کرتی ہے اور اس کے عزائم سے خائف ہے۔ شاہ عبداللہ نے صدر میکرون کے ہمراہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں دو ریاستی حل کے مدہم پڑتے امکانات، مغربی کنارے کے الحاق اور یہودی بستیوں کی مسلسل توسیع کے حوالے سے گہری تشویش ظاہر کی تھی؛ کیونکہ یہ اقدامات فلسطینیوں کی جبری بے دخلی اور اردن کو "متبادل وطن" بنانے کے خدشات کو براہِ راست تقویت دیتے ہیں۔

ان گہرے فوجی، سلامتی اور سیاسی خطرات کے پیشِ نظر، اردنی حکومت اپنی دفاعی صلاحیتوں کو وسعت دینے کی ناگزیر ضرورت محسوس کرتی ہے، خاص طور پر فضائی دفاع، انٹیلی جنس، نگرانی اور جاسوسی کے نظام کو جدید خطوط پر استوار

کرنے کے ذریعے، اور غیر روایتی جنگی ٹیکنالوجی، جیسے کہ ڈرونز اور سائبر سیکیورٹی کے شعبوں میں جدید آلات کے ذرائع کو متنوع بنانا چاہتی ہے۔ حکومت نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اپنی بقا اور سیاسی استحکام کی ضمانتوں کے عوض بعض یورپی ممالک، علاقائی طاقتوں اور چین کے عزائم و مفادات کی تکمیل کے لیے اپنے جغرافیائی سیاسی (جیو پولیٹیکل) مقام کو بطورِ ہتھیار استعمال کر کے اپنے دفاع کو مضبوط کر سکتی ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے حکومت نے جدید جنگی طریقوں کا ساتھ دینے کی خاطر اپنی فوج کی از سرِ نو ساخت گری کی کوشش کی تاکہ فوج کو ان غیر ملکی قوتوں کے مفادات کی پاسداری کا ذریعہ بنایا جا سکے؛ اور فرانس، جس نے ایک دہائی سے اردن میں اپنے فوجی اڈے قائم کر رکھے ہیں، ایسا ہی ایک بڑا شراکت دار ہے۔

اس معاہدے کے پیچھے فرانس کا یہ قدم دراصل یورپ کی اس دلی خواہش کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خطے کے تنازعات میں بعض فریقوں کے حق میں امریکہ کی کھلی اور اندھی جانبداری کے مقابلے میں خود کو عرب ممالک کے لیے ایک متبادل اور زیادہ متوازن شراکت دار بنا کر پیش کرے۔ سرزمینِ شام (بلادِ شام) میں پیرس اور لندن کے مابین مفادات کی دیرینہ ہم آہنگی موجود ہے؛ اور اپنی جغرافیائی سیاسی بنیاد میں، اردن اور فرانس کا یہ معاہدہ ایک مسابقتی اور خود مختارانہ حیثیت کا حامل ہے جس کا ہدف اس تاریخی دائرہ اثر میں سے جو کچھ بھی بچایا جا سکتا ہے اسے بچانا ہے۔ یہ حکمتِ عملی امریکی خارجہ پالیسی کے غیر متوازن اتار چڑھاؤ اور انتخابی معرکوں میں امریکی پالیسی سازوں کے الجھاؤ سے الگ ہو کر اپنے اہم ترین مفادات کے تحفظ کی فرانسیسی اور برطانوی خواہش کے زیرِ اثر تشکیل پائی ہے۔ حالیہ دنوں میں اردن نے متعدد مشترکہ دفاعی معاہدوں کا جال بچھایا ہے: اس نے 2021 میں امریکہ کے ساتھ معاہدہ کیا، اور پیرس کے ساتھ طے پانے والے اس تازہ ترین اور چوتھے معاہدے سے قبل، وہ آسٹریا اور نیدرلینڈز کے ساتھ بھی ایسے ہی معاہدات کر چکا ہے۔ یہ تمام پیش رفت گزشتہ برس برسلز میں عمان کے اندر نیٹو کے سفارتی رابطہ دفتر کے قیام کے معاہدے اور اردن و برطانیہ کے مابین عسکری تعاون اور ہم آہنگی کو فروغ دینے پر ہونے والی حالیہ بات چیت کا تسلسل ہیں۔

اب اردنی عوام میں یہ سوال گونج رہا ہے کہ یہ تمام معاہدات اردن اور اس کے باسیوں کے حقیقی مفادات کا کس طرح تحفظ کر سکتے ہیں، یا اس کی سلامتی، بے دردی سے لوٹے جانے والے وسائل، برباد ہوتی معیشت اور فلک بوس قرضوں کا دفاع کیسے کر سکتے ہیں؟ عوام یہ نکتہ بھی اٹھا رہے ہیں کہ یہ سودے بازی یہودی وجود کی جانب سے درپیش خطرات، خصوصاً جبری بے دخلی، اور دو ریاستی حل کی ناکام سفارت کاری کا کیا سدِباب کر سکتی ہے؟ یہاں نام نہاد جمہوری سرمایہ دارانہ ریاستوں کی کھلی منافقت بے نقاب ہو جاتی ہے؛ وہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اس حکومت کے ساتھ ہم

آہنگی اور گٹھ جوڑ برقرار رکھے ہوئے مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں جو آمریت، وحشیانہ جبر، آوازوں کو کچلنے اور اقربا پروری کی علامت ہے، اور یہ سب کچھ خود اس کے اپنے ہی عوام کی بربادی کی قیمت پر ہو رہا ہے۔

اردن کا "کافر، استعماری مغرب" کی بیساکھیوں پر بھروسا کرنا سرمایہ دارانہ سیاست کے اپنے پیمانوں پر بھی ایک ہارا ہوا جوا ہے، ایک ایسی سیاست جو خالصتاً مفادات، نفع خوری اور بحرانوں کے عارضی بندوبست پر کھڑی ہے اور جو اپنے مفادات اور بالادستی کی ضرورت کے مطابق لمحہ بہ لمحہ پینترا بدلتی ہے۔ اس نظام میں نہ کوئی مخلص دوست ہوتے ہیں، نہ مستقل اتحاد اور نہ ہی دائمی آلہ کار؛ جونہی کوئی حکمران یا دست نگر حکومت ان کے مفادات کی تکمیل کے قابل نہیں رہتی، یا ان کی راہ کا پتھر بنتی ہے، تو وہ بلا تاخیر اسے اور اس کے پورے سیاسی ڈھانچے کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔ اگر کوئی حکومت اپنی بقا اور تحفظ کی بنیاد اپنے ہی عوام کے خلوص پر نہ رکھے تو وہ اپنے حریص دشمنوں کے مقابلے میں کہیں سے کوئی پناہ یا مدد نہیں پا سکتی۔

یہاں یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ فرانس ہرگز کوئی "دوست" نہیں ہے جیسا کہ مقامی سرکاری ذرائع ابلاغ اسے پیش کر کے مسلمانوں کو فریب دینے اور ان معاہدوں کا جواز گھڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دور سے ہی فرانس نے اسلام اور مسلمانوں پر عسکری اور فکری یلغار میں ہمیشہ ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے۔ اس تاریخی بغض کو سمجھنے کے لیے 1917 میں بلادِ شام پر فرانسیسی قبضے کے دوران دمشق میں فاتحِ بیت المقدس صلاح الدین ایوبی کے مزار پر کھڑے ہو کر فرانسیسی جنرل ہنری گورو کے تکبر بھرے الفاظ یاد کر لینا ہی کافی ہے کہ: "ہم لوٹ آئے ہیں، اے صلاح الدین! اب اٹھو"۔ تیونس اور الجزائر پر فرانس کا استعماری قبضہ، جس کے دوران مسلمانوں کا بہیمانہ قتلِ عام کیا گیا، لاکھوں الجزائریوں کا خون بہایا گیا، اور ہزاروں شہداء کے سر قلم کر کے انہیں پیرس کے 'میوزیم آف مین' (Museum of Man) میں نوادرات کے طور پر سجایا گیا، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کی صلیبی عداوت کا کھلا ثبوت ہے۔ مزید برآں، خود صدر میکرون ماضی قریب میں اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ اسلام "پوری دنیا میں بحران کا شکار ہے"۔ اس تمام تر دشمنی کا واحد پلید مقصد یہ ہے کہ: خلافت کے دوبارہ قیام کا راستہ روکا جائے، ایک ایسی ریاست جس کے ظہور کا وقت اب آن پہنچا ہے تاکہ وہ ان استعمار پسندوں کے عزائم اور منصوبوں کے پردے چاک کرے، اور روئے زمین پر وہ عدل اور رحمت نافذ کرے جس کی تلاش میں آج کی دنیا تڑپ رہی ہے۔

سوڈانی حکومت اور بحرانوں کی پیداوار: ایندھن بطور ایک عملی مثال

سوڈان کے دارالحکومت اور کئی ریاستوں میں ایندھن کا بحران شدید تر ہو گیا ہے، جہاں سروس اسٹیشنوں پر گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ کئی دنوں سے پیٹرول پمپس کو سپلائی کی شدید قلت کا سامنا ہے، جس کی وجہ سے گاڑیوں کے مالکان گھنٹوں انتظار کرنے پر مجبور ہیں۔ اس دوران ایندھن کی متوازی (بلیک) مارکیٹ خوب پھل پھول رہی ہے؛ جہاں پیٹرول کی فی گیلن قیمت تقریباً 60,000 پاؤنڈ تک پہنچ چکی ہے، جبکہ ڈیزل 65,000 سے 70,000 پاؤنڈ کے درمیان فروخت ہو رہا ہے، اس کے مقابلے میں سروس اسٹیشنوں پر قیمت تقریباً 45,000 پاؤنڈ ہے (جہاں پیٹرول کی فی گیلن سرکاری قیمت تقریباً 37,000 پاؤنڈ مقرر ہے)۔ (سوڈان ٹریبیون، 30 ستمبر 2026)۔

حزب التحریر کے مرکزی میڈیا آفس کے ریڈیو نشریات کے لیے لکھے گئے ایک تبصرے میں ولایہ سوڈان میں حزب التحریر کے آفیشل ترجمان ابراہیم عثمان (ابو خلیل) نے کہا: "حکومت، جس کی نمائندگی وزارتِ پیٹرولیم کر رہی ہے، یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ایندھن اور اس کے ضمنی مصنوعات دستیاب ہیں، لیکن زمینی حقیقت بحران کے وجود کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کا کھلا ثبوت سروس اسٹیشنوں پر گھنٹوں سے کھڑی گاڑیوں کی طویل قطاریں ہیں؛ علاوہ ازیں، ہوش ربا قیمتوں والی بلیک مارکیٹ کا وجود تقسیم کے نظام میں خرابی کو ثابت کرتا ہے۔ یہ مصنوعی بحران کبھی پیدا نہ ہوتے اگر نظام محض مالی وصولیوں اور ٹیکسوں کے بجائے عوام کے معاملات کی نگہبانی و راعی کے اصول پر استوار ہوتا، جیسا کہ اس وقت ہم پر اپنی بدترین شکلوں میں مسلط سرمایہ دارانہ نظاموں میں ہوتا ہے۔ جب تک یہ نظام ہم پر مسلط رہیں گے، وہ منافع خوری کے لیے اسی طرح بحران پیدا کرتے رہیں گے۔ ہماری واحد نجات عوام کی حقیقی نگہبانی کے لیے وقف نظام کے قیام میں ہے: یعنی نبوت کے نقشِ قدم پر خلافتِ راشدہ، ایک ایسا نظام جس کے ذریعے ہم اپنے رب کو راضی کر سکیں اور ایسے بحرانوں سے آزاد زندگی گزار سکیں۔"

معاشی بحرانوں کے حقیقی حل اور بنیادی علاج کی طرف

معاشی بحران کا حقیقی حل اور بنیادی علاج سود (ربا) کے حتمی اور ناقابلِ تنسیخ خاتمے، کرنسی پر اعتماد کی بحالی، مالیاتی نظم و ضبط کے از سرِ نو قیام، اور حقیقی معیشت کی خدمت کے لیے مالیاتی نظام کی درست سمت بندی سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں سونے اور چاندی کی بحیثیتِ خود مختار کرنسی واپسی، یا ان کی نمائندگی کرنے والے کاغذی نوٹوں کا اجرا، یا ان دونوں دھاتوں کی ایک مخصوص مقدار سے تائید شدہ سرٹیفکیٹس کا نفاذ بھی شامل ہے۔ اس تناظر میں، ہم وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ خلافت کی ریاست کے سوا کوئی بھی ادارہ یا وجود یہ قدم نہیں اٹھا سکتا، جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اذن سے عنقریب قائم ہو گی۔ ایسا اس لیے ہے کہ سونے اور چاندی میں لین دین ایک لازمی اور ناگزیر امر ہے، ایک ایسا شرعی حکم جس کا نفاذ واجب ہے، خاص طور پر اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ سرمایہ دارانہ نظام کے کئی آلات، جیسے سود، اجارہ داری و ذخیرہ اندوزی، اور غرر (بے جا قیاس آرائی و سٹہ بازی)، شریعت میں قطعی حرام ہیں۔ لہٰذا، ہمیں نبوت کے نقشِ قدم پر دوسری خلافتِ راشدہ کے قیام کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اس کا قیام ہر مسلمان پر ایک شرعی فرض ہے یہاں تک کہ یہ عملاً قائم ہو جائے؛ کیونکہ یہی خلافت ہے جو امت کو تاریکیوں کی گہرائیوں سے نکال کر اسلام کے عدل اور نور کی طرف لے جائے گی۔

اے مسلمانو! ہمیں اسلام کو مکمل طور پر نافذ کرنا ہو گا اور اپنی زندگی کے طرزِ عمل کو اسی پر استوار کرنا ہو گا؛ کیونکہ شرعی طور پر ہم اس پر عمل کرنے کے پابند ہیں، اور ہم اس شرعی فریضے سے اس وقت تک بری الذمہ نہیں ہو سکتے جب تک اسلام ہماری زندگیوں کی بنیاد نہ بن جائے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ﴾ "کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو بار آزمائے جاتے ہیں؟ پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں" [سورۃ التوبہ: آیت 126]۔

امریکہ اور ایران کے مابین جنگ: غالب قوت بمقابلہ ابھرتی ہوئی طاقت

تحریر: استاذ سالم ابو سبیتان

(ترجمہ)

حالیہ تصادم نے ایک ایسی غالب قوت کو، جو افرادی قوت اور اسلحے کے اعتبار سے بے پناہ ہے، زبردست فضائی برتری رکھتی ہے، ایک بے مثال اور دیو قامت بحریہ کی مالک ہے، نفری اور رسد دونوں لحاظ سے وسیع بری افواج سے لیس ہے، اور دنیا بھر میں فوجی اڈوں کا ایک عالمگیر نیٹ ورک رکھتی ہے، ایک حریف کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ یہ غالب طاقت اپنے مدار میں ایسی مضبوط ریاستوں کے ایک جھرمٹ کے ساتھ متحرک ہے جو اس کے مفادات کی نگہبانی کرتی ہیں، جبکہ اس کے ساتھ ایسی ماتحت اور فرمانبردار ریاستیں بھی موجود ہیں جن کے وجود کا مقصد ہی محض اس کے احکامات کی بجا آوری ہے۔

یہ غیر ملکی سرزمین پر جنگ لڑتی ہے، اور اپنی اسٹریٹجک گہرائی، یعنی خود اپنی امریکی سرزمین، کو دشمنوں کی پہنچ سے بہت دور محفوظ رکھتی ہے؛ جسے سمندروں، طویل فاصلوں، جوہری ڈیٹرنس، زمین کے چپّے چپّے پر نظر رکھنے والی سیٹلائٹ نگرانی، اور دنیا کی طاقتور ترین انٹیلی جنس ایجنسیوں کا تحفظ حاصل ہے۔

تاہم، اس دیو قامت فوجی مشین، جس کی سیاسی قیادت نے ایرانی میدانِ جنگ کے حقائق کا غلط اندازہ لگایا، کے مدِمقابل ایک نسبتاً چھوٹی قوت کھڑی ہے، جو نفری، سازوسامان اور صلاحیتوں کے اعتبار سے محدود ہے، اور خستہ حال بنیادی ڈھانچے کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ یہیں سے وہ اٹل الٰہی وعدہ سامنے آتا ہے جو ایک وسیع تر اور گہرے تناظر میں منظرنامے کی نئی تشکیل کرتا ہے: کہ بادشاہت و اقتدار کا حقیقی مالک صرف اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) ہے؛ وہ جس سے چاہتا ہے، جب چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے، خواہ وہ امریکہ جیسی عالمی سپر پاور ہی کیوں نہ ہو، اور جس کو چاہتا ہے، جب چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے، چاہے وہ بہت ہی کم تر طاقت ہو، قطع نظر اس کے کہ ایسی طاقت کے روایتی مادی اسباب موجود ہوں یا نہ ہوں۔

ہماری اپنی ہی زندگی میں، محض پچھلے پچاس برسوں کے دوران، موجود رہنے والی سلطنتوں کے زوال اور خاتمے کا جو مشاہدہ آج ہم کر رہے ہیں، وہ ہمیں ٹھہر کر غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ برطانوی، فرانسیسی اور سوویت سلطنتیں ابھریں اور پوری دنیا پر چھا گئیں، انہوں نے اقوام کو بے دردی سے غلام بنایا اور بے رحمی سے ان کے وسائل کو نچوڑا؛ لیکن اس کے باوجود وہ کسی ایسی براہِ راست جنگ کے بغیر ہی حیرت انگیز طور پر منہدم اور برباد ہو گئیں جو ان کی شکست کا سبب بنتی، اور اپنے پیچھے سوائے اپنے اصل ناموں، فرانس، برطانیہ اور روس، کے کچھ نہ چھوڑ گئیں۔

ان سلطنتوں کے سقوط کے اسباب کا گہرا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ روایتی معنوں میں کوئی عسکری شکست نہیں تھی؛ بلکہ اس کے پسِ پشت متعدد عوامل کا باہمی ملاپ کارفرما تھا، جس نے فوجی مہمات اور عوامی مزاحمت کو محض "اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا" بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان عوامل کا معروضی انداز میں جائزہ لینا ضروری ہے:

• نوآبادیاتی پھیلاؤ اور توسیع پسندی

• فساد پھیلانا اور قوموں کو غلام بنانا

• محکوم قوموں کے وسائل کی لوٹ مار، اور ساتھ ہی انہیں بھوک اور ذلت سے دوچار کرنا

• خود سلطنتوں کے مابین باہمی تنازعات اور سازشیں

• ان اصولوں کی ناقص بنیاد جن پر وہ قائم کی گئی تھیں، ایسے اصول جن کی جڑیں ذاتی مفاد اور بدعنوانی میں پیوست تھیں

• تکبر اور بڑائی کا وہ حد سے بڑھا ہوا احساس جس نے اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) کی آفاقی سنتوں (قوانین) کو چیلنج کیا؛ کیونکہ جو کوئی بھی اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) کی عظمت و کبریائی کے معاملے میں اس سے سرکشی کرتا ہے، وہ (سبحانہ وتعالیٰ) اسے لازماً ذلیل و خوار کر دیتا ہے

• ان سلطنتوں کے اندر عدل و انصاف کا فقدان

ماضی کی یہ سلطنتیں آج محض اپنی بقا کی جدوجہد کر رہی ہیں، کیونکہ انہیں احساس ہے کہ ان کا حتمی زوال ناگزیر ہے۔

امریکہ بھی اس تاریخی روش سے مستثنیٰ نہیں ہے؛ وہ وسیع سمندروں کے پار اپنی طاقت مستحکم کرنے اور لاکھوں مقامی امریکیوں (ریڈ انڈینز) کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے بعد عالمی منظر نامے پر ابھرا، جس نے انہیں عملاً لوک کہانیوں اور قصے کہانیوں کے دائرے تک محدود کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم نے اسے وہ موقع فراہم کیا جو خود اس کی گود میں آ گرا، جس

کے نتیجے میں وہ چوتھی بڑی سلطنت بن گیا اور سوویت یونین کے ساتھ عالمی غلبے میں شراکت دار بنا۔ دونوں نے مل کر پرانی سلطنتوں، جن میں سب سے بڑھ کر "عظیم" برطانیہ اور فرانس شامل تھے، کا بستر گول کرنے پر اتفاق کیا۔ جب ان کا اثر ورسوخ محدود ہو گیا، تو امریکہ نے اپنی سازشوں اور چالوں کا رخ سوویت یونین کی طرف موڑ دیا، جس میں اسے کمیونسٹ آئیڈیالوجی (نظریے) کے فکری دیوالیہ پن اور اپنے تسلط تلے کراہتے عوام کو کوئی قابلِ قدر چیز فراہم کرنے میں اس کی ناکامی سے مدد ملی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سلطنت بھی منہدم ہو گئی، سیاسی نقشے سے غائب ہو گئی، اور سمٹ کر آج کا روس بن گئی، ایک ایسی ریاست جو اب اپنے دارالحکومت ماسکو یا اپنی سرزمین تک کی حفاظت کرنے سے قاصر ہے۔

اپنے پیشروؤں کا انجام امریکہ، جو عالمی سلطنتوں کی آخری کڑی ہے، کے لیے کوئی سامانِ عبرت نہ بن سکا، اور نہ ہی اس نے تاریخ کے اسباق سے کوئی نصیحت پکڑی۔ اس کے برعکس، اس کے تکبر اور غرور میں مزید اضافہ ہی ہوا؛ اس نے ریاستوں کی دولت کو نچوڑا، ان کے عوام کو کنگال کیا، اور ان کی فاقہ کشی پر بھی جشن منایا۔ اس کی سرکشی اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے بستیوں کے قتلِ عام اور ان کے علاقوں کی بربادی کو فطری اور ناگزیر عمل سمجھ لیا۔ اس نے ویتنام کو تباہ کیا، جاپان پر ایٹم بم گرائے، اور افغانستان، عراق، شام، لیبیا، یمن، لبنان اور ایران میں تباہی مچائی، اور اس دوران وہ زمین پر اپنے بے لگام ظلم اور فساد پر مسلسل قائم رہا۔ اس کے یکطرفہ غلبے اور بے پناہ طاقت نے اسے اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) کی ان الٰہی سنتوں (قوانین) سے اندھا کر دیا جنہوں نے اس کے پیشروؤں کو تباہ کیا تھا، وہ سنتیں جو اب اس پر بھی بالکل وہی عذاب اور انجام لا رہی ہیں جو انہوں نے پہلوں پر نازل کیا تھا۔

امریکہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے اور مکڑی کے جالے سے مشابہ ہو گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سب سے کمزور ترین گھر مکڑی کا جالا ہی ہے، کاش وہ یہ بات جان لیتے۔ امریکہ کے کئی دانشوروں اور مفکرین نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور وہ فی الوقت اس کمزوری اور زوال کو بیان کر رہے ہیں؛ لیکن طاقت کے نشے، تکبر، اور دوسروں پر اس کے چھائے ہوئے خوف کی پیدا کردہ اندھی کیفیت نے اسے اپنی ہی رسوائی اور بے بسی کو دیکھنے سے قاصر کر دیا ہے، یا وہ اس بے مثال سماجی انتشار، اخلاقی انحطاط، غربت، بھوک، بحرانوں، اور 40 ٹریلین (کھرب) ڈالر سے زائد کے ناقابلِ ادائیگی قرضے کو دیکھنے سے عاجز ہے جو اسے اندر سے چاٹ رہا ہے۔

یہ ایک لاعلاج اندھا پن اور ایک ایسا زوال ہے جس سے پلٹنا ممکن نہیں؛ چنانچہ امریکہ کا مقدر داخلی انتشار و انہدام اور عالمی منظرنامے سے پسپائی ہے، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے، اور خواہ وہ اسے تسلیم کرے یا نہ کرے۔ وہ زمین پر ظالموں،

جابروں، متکبروں اور فساد برپا کرنے والوں کے بارے میں جاری الٰہی قوانین کے خلاف برسرِپیکار ہے۔ ہم اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اس عظیم اور زمین ہلا دینے والے زوال کی گھڑی دکھائے، اور یہ کہ یہ ہمارے ہاتھوں وقوع پذیر ہو۔ اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) کا ارشاد ہے:﴿ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ * بِنَصْرِ اللَّهِ يَنصُرُ مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ﴾ "اور اس دن مومن اللہ کی نصرت سے خوش ہوں گے؛ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، اور وہی زبردست اور نہایت رحم کرنے والا ہے" [سورۃ الروم: آیت 4-5]۔

جوں جوں ”دردِ زہ“ شدت اختیار کر رہا ہے، دنیا کس نومولود کی منتظر ہے؟

تحریر: انجینئر وسام الاطرش

(ترجمہ)

ایران کے ساتھ محاذ آرائی نے یہ حقیقت آشکار کر دی ہے کہ عالمی سطح پر طاقت کے توازن کو اب محض اعداد و شمار کے ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ ایک ایسی ریاست جو سب سے بڑی افواج، جدید ترین ہتھیاروں، وسیع ترین فوجی اڈوں اور اتحادیوں کے سب سے بڑے نیٹ ورک کی مالک ہو، وہ بھی ایک ایسی حد تک پہنچ کر رک سکتی ہے جس سے آگے بڑھنا اس کے بس میں نہ ہو؛ اس محاذ آرائی میں امریکہ پر اپنی اس صلاحیت کی تنگ دامانی عیاں ہو گئی کہ وہ اپنی عسکری اور تکنیکی برتری کو کسی فیصلہ کن فوجی یا سیاسی نتیجے میں تبدیل کر سکے۔

اس کے برعکس، طاقت اب محض افواج اور معیشت تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس کا دائرہ ٹیکنالوجی، سیمی کنڈکٹرز، مصنوعی ذہانت، توانائی، ڈیٹا، سپلائی چینز اور اس متزلزل دنیا کے اصول و ضوابط پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت تک پھیل چکا ہے۔ چنانچہ، موجودہ واقعات محض ایک طاقت سے دوسری طاقت کی طرف اثر و رسوخ کی منتقلی سے کہیں آگے کے ہیں، جیسا کہ بعض لوگ گمان کر سکتے ہیں، بلکہ یہ بین الاقوامی نظام کی بنیادی ساخت میں پیدا ہونے والے بگاڑ کی عکاسی کرتے ہیں۔ عالمی منظر نامے پر گرفت رکھنے کی پرانے نظام کی صلاحیت دم توڑ رہی ہے، اور اس افراتفری کے بیچ اسے بچانے کی پکاریں بلند ہو رہی ہیں، اگرچہ کسی متبادل کے خدوخال ابھی واضح ہونا باقی ہیں۔ یہیں آکر ”دردِ زہ“ کی اصطلاح اپنے حقیقی معنی پاتی ہے: یعنی وہ مرحلہ جس میں ایک بگڑا ہوا نظام شکست و ریخت سے دوچار ہوتا ہے جبکہ اس کے بطن میں ایک نئی حقیقت پرورش پا رہی ہوتی ہے، لیکن نومولود ابھی دنیا کے سامنے نہیں آیا ہوتا۔

اقوام متحدہ میں، دنیا کی ریاستیں ایک ایسے ادارے کے سائے تلے جمع ہوئیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور کے لیے قائم کیا گیا تھا، جبکہ اب خود اس ادارے کی اس اہلیت پر سوالات اٹھ رہے ہیں کہ کیا وہ اس کہیں زیادہ پیچیدہ دنیا کے بحرانوں اور مسلح تصادم کی حد سے کم تر سرگرمیوں سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ادھر واشنگٹن اور بیجنگ کے مابین

تجارت، ٹیکنالوجی، سپلائی چینز، سیمی کنڈکٹرز اور مصنوعی ذہانت کے میدان میں مقابلہ بدستور جاری ہے، یہ ایک ایسی کشمکش ہے جو محض منڈیوں تک محدود نہیں بلکہ مستقبل کے ضوابط کو تشکیل دینے کی جنگ ہے۔ واشنگٹن میں چینی صدر یہ اعلان کرتے ہیں کہ امریکہ اور چین کو ایک دوسرے کا حریف بننے کے بجائے شراکت دار ہونا چاہیے۔ اسی دوران، یورپ میں سلامتی، توانائی، اسٹریٹجک خودمختاری اور بڑی طاقتوں کے درمیان براعظم کی حیثیت کے حوالے سے خدشات اور سوالات بڑھ رہے ہیں، خاص طور پر روس کی طرف سے پیدا ہونے والے ہائبرڈ خطرات کی لہر کے تناظر میں۔ جہاں تک ٹیکنالوجی کا تعلق ہے، تو وہ محض ایک معاشی شعبے سے آگے بڑھ کر سلامتی، خودمختاری اور بین الاقوامی اثرورسوخ کا ناگزیر جزو بن چکی ہے۔ رہے مسلم حکمران، تو ان کا سب سے عام رویہ یہ ہے کہ وہ فلسطین پر دکھ کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور عالمی برادری کی خاموشی پر تنقید کرتے ہیں، جبکہ خود اس جرم میں برابر کے شریک ہیں؛ بھلا کیا مسجد اقصیٰ کی آزادی اقوام متحدہ کی چوکھٹ پر ناک رگڑنے میں پنہاں ہے؟

اگرچہ یہ تمام مناظر بظاہر الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر یہ آشکار کرتے ہیں کہ بین الاقوامی نظام اب تنازعات کے تصفیے یا انہیں قابو میں رکھنے کے لیے کافی نہیں رہا، اور نہ ہی اس کے ادارے ان اصولوں کو قائم رکھنے کے قابل ہیں جن پر ان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جنگوں اور پامالیوں نے، بالخصوص غزہ میں، اس نظام کے منشور اور زمینی سطح پر اس کے اداروں کی عملی صلاحیت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو طشت از بام کر دیا ہے۔ اس گہری دراڑ کے بیچ سے اصلاح اور بچاؤ کی دہائیاں بلند ہو رہی ہیں؛ بگاڑ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اس کی معمولی مرمت ممکن نہیں رہی، اور دنیا بھر کے عوام چشم براہ ہیں کہ کوئی نیا نظام جنم لے، ایک ایسا متبادل بین الاقوامی نظام جس کے خدوخال ابھی ابھرنا باقی ہیں۔ تاہم، یہ بات بالکل یقینی ہے کہ انسانیت کو ایک ایسے نظام کی اشد ضرورت ہے جو زیادہ محفوظ اور عادلانہ ہو، اور جو ظلم، جبر اور سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ بحرانوں اور آفات کا مقابلہ کرنے کے لیے کہیں زیادہ لیس ہو، ایسی تباہ کاریاں جن کے اثرات اب کسی ایک معاشرے یا ریاست تک محدود نہیں رہے، بلکہ وہ پوری زمین پر ایک بوجھ بن چکے ہیں۔

چونکہ ریاستوں کی بنیاد اصلاً افکار و نظریات پر قائم ہوتی ہے، اس لیے حقیقی طاقت کا آغاز ان قواعد وضوابط کو قائم کرنے کی صلاحیت سے ہوتا ہے جو ریاستوں کے طرزِ عمل اور بین الاقوامی لین دین کو منظم کرتے ہیں۔ یہ طاقت ایک ایسے اصولی نظریے کی بنیاد پر بین الاقوامی سیاست پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے جو انسانی وقار کو ترجیح اول بناتا ہو۔

لیکن اس کے برعکس، ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی طاقتیں فکری دیوالیہ پن اور تہذیبی بھٹکاؤ کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہیں، اور انہوں نے خود کو ایک ایسے سیاسی تعطل میں جکڑ رکھا ہے جہاں ہر طاقت محض دوسروں کے زوال سے اپنی برتری کشید کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نتیجتاً، آج بڑی طاقتوں کے درمیان کشمکش محض اثر و رسوخ کا کھیل نہیں ہے، بلکہ یہ طے کرنے کی جنگ ہے کہ وہ کون ہے جو اس ماحول کو تشکیل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے دائرے میں آنے والے کل کی دنیا کا نظام چلے گا۔

تاہم، تبدیلی کا یہ عمل محض بڑی طاقتوں تک ہی محدود نہیں ہے؛ بلکہ یہ خود دنیا کی ساخت کے اندر رونما ہو رہا ہے۔ اگرچہ ریاستیں بدستور بنیادی کردار ہیں، لیکن ٹیکنالوجی کمپنیوں نے سرحد پار کی صلاحیتیں حاصل کر لی ہیں؛ وہ اپنی قوت سرمائے اور عالمی مالیاتی نیٹ ورکس سے، معلومات، ڈیٹا اور ڈیجیٹل ڈھانچے کی اجارہ داری سے، اور سیاسی و عسکری طاقت کے مراکز کے ساتھ گٹھ جوڑ سے حاصل کرتی ہیں، جن میں یہودی وجود اور صیہونی تحریک سے وابستہ اثر و رسوخ کے نیٹ ورک بھی شامل ہیں۔ یہ چیز ان میں سے بعض کمپنیوں کو حدود سے تجاوز کرنے اور کمزور ریاستوں کے بہت سے ضابطہ کار نظاموں سے بچ نکلنے کی طاقت فراہم کرتی ہے۔

عالمی معیشت اگرچہ باہم مربوط ہے، لیکن سپلائی چینز اب اسٹریٹجک حساب کتاب کا ناگزیر حصہ بن چکی ہیں۔ ٹیکنالوجی اس قدر تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے کہ سیاسی ادارے اس پر قابو پانے کے قواعد وضع کرنے کی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہے۔ بین الاقوامی ادارے اپنی جگہ قائم تو ہیں، مگر جن ضوابط پر ان کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ تنِ تنہا ان تمام تر نئی تبدیلیوں کا احاطہ کرنے کے لیے ناکافی ہو چکے ہیں۔

چنانچہ پرانا اور نیا ایک ہی وقت میں اکٹھے موجود ہیں: بیسویں صدی کے ادارے اکیسویں صدی کے وسائل کے ساتھ؛ خود مختار ریاستیں سرحد پار معاشی و تکنیکی طاقتوں کے ہمراہ؛ اور فرسودہ قوانین ہائبرڈ جنگ اور طاقت کے مسلسل بدلتے توازن کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ لیکن، اگر یہ وہ دردِ زہ ہے جس سے دنیا گزر رہی ہے، اپنی تمام تر سفاکی اور انسانی اقدار کی پامالی کے ساتھ، تو پھر اس درد کی کوکھ سے کس قسم کے بچے کا جنم ہو گا؟

یہاں معاملہ محض موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر امریکہ، چین، یورپ اور دیگر کے مابین طاقت کی نئی تقسیم سے کہیں بلند ہے؛ بلکہ یہ سوال اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے: کیا کوئی ایسا نیا نظام وجود میں آئے گا، جو انسانی استحصال کی تمام شکلوں اور معاشروں و انسانی اقدار کی منظم بربادی کا خاتمہ کر دے، اور اس طرح طاقت، حاکمیت اور وحدت کے یکسر مختلف

نمونے قائم کرے؟اس تاریک منظر نامے میں، امتِ مسلمہ اس تہذیبی متبادل کی تشکیل کے عمل کا ایک ناگزیر حصہ بن کر ابھرتی ہے جس کی انسانیت منتظر ہے، اور یہ وہ کردار ہے جس کا تقاضا خود اس کا عقیدہ کرتا ہے۔ یہ وہ امت ہے جو ایک بکھری ہوئی حقیقت کے بوجھ تلے دبی ہے، اپنے قائدانہ کردار، اپنی ہراول حیثیت اور تہذیبی مقام سے محروم ہو جانے کے نتائج بھگت رہی ہے؛ تاہم اس سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ اپنے اندر دوبارہ ابھرنے اور اس کردار کو بحال کرنے کی فطری صلاحیت رکھتی ہے جس نے کبھی تاریخ پر انمٹ نقوش ثبت کیے تھے۔

کیونکہ امتِ مسلمہ، جس نے ایک صدی قبل اپنے متحد سیاسی وجود کو کھو دیا تھا اور جس کے بعد اسے کمزور ریاست نما علاقوں، فرضی سرحدوں اور متضاد سیاسی ایجنڈوں کے انبار میں بانٹ دیا گیا تھا، نہ تو اپنا تہذیبی وجود کھو چکی ہے اور نہ ہی وہ عقیدے کی ڈور جو اسے باہم جوڑتی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس، اس نے مسلسل اس شعور کی آبیاری کی ہے جو ایک مرکزی سوال کا جواب دینے کے لیے درکار ہے: کہ امت کس طرح اپنی وحدت، اپنی خود مختاری اور اپنا برحق مقام دوبارہ حاصل کر سکتی ہے؟

اس کا جواب نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کی پیوند کاری میں مضمر ہے اور نہ ہی غلامی کی ایک شکل کو دوسری شکل سے بدلنے میں؛ بلکہ اس کا جواب اسلام کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر سیاسی وجود کی از سر نو تعمیر میں ہے، ایک ایسا وجود جو مسلمانوں کو ایک واحد قیادت کے ماتحت متحد کرے، جو دین کو مضبوطی سے تھامے رکھے اور سنت پر مضبوطی سے جم جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دردِ زہ کے اس سارے عمل کی اصل اہمیت کھل کر سامنے آتی ہے۔

اگر "دردِ زہ" اس بات کی علامت ہے کہ ایک پرانی حقیقت بے بسی اور زوال کے آخری کنارے پر پہنچ چکی ہے جبکہ ایک نئی حقیقت کے عناصر متشکل ہو رہے ہیں، تو اہلِ بصیرت کی نگاہ میں یہ نو مولود ایک الٰہی وعدہ اور خوشخبری ہے: یعنی نبوت کے نقشِ قدم پر خلافتِ راشدہ۔ یہ وجود عالمی سطح پر ایک فعال اور موثر کردار ادا کرے گا، نہ کہ محض بڑی طاقتوں کی باہمی چپقلش اور کشمکش کا اکھاڑا بنا رہے گا۔

ہو سکتا ہے کہ دردِ زہ کا یہ دور لمبا کھنچ جائے اور ولادت کی کوششیں لڑکھڑا جائیں، لیکن ایک بات طے ہے: دنیا اب ویسی نہیں رہی جیسی وہ کبھی تھی۔ طاقت کا مفہوم خود ایک نیا روپ دھار رہا ہے، اور سرمایہ داریت کے پیدا کردہ اداروں، ضوابط اور اتحادوں کی لرزہ براندام عمارتوں کی بنیادیں شدید خطرات کی زد میں ہیں۔

یہی وہ بات ہے جس کا خوف مغرب پر پہلے سے کہیں زیادہ طاری ہے؛ اسی لیے امت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے اس کی وحشت اور بربریت میں مسلسل شدت آرہی ہے، کیونکہ وہ بخوبی بھانپ چکا ہے کہ ولادت کا وقت بالکل آن پہنچا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ ہم اس وقت ایک ایسے فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہیں جو آہستہ آہستہ دم توڑتی ہوئی حقیقت اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اذن سے عنقریب جنم لینے والی نئی حقیقت کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ یہ امت، جس کے بارے میں بعض لوگوں نے گمان کر لیا تھا کہ اس کا سیاسی وجود مٹ چکا ہے اور اس کا کردار تمام ہو گیا، آج بھی پوری قوت سے موجود اور زندہ و پائندہ ہے۔ یہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اس کے رب کی کتاب اس کے ہاتھوں میں ہے اور مخلص لوگ اسلامی طریقے کے مطابق دوبارہ زندگی کا آغاز کرنے کی دعوت کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾ "اور فتح و نصرت تو بس اللہ ہی کی طرف سے ہے جو غالب اور بڑی حکمت والا ہے" [سورۃ آل عمران: آیت 126]۔

امت ان لوگوں کی کثرت سے زندہ نہیں ہوتی جو اسلام کا محض زبانی دعویٰ کرتے ہیں؛ بلکہ یہ ان لوگوں سے زندہ ہوتی ہے جن کے دل اسلام سے لبریز ہوں

ایک مسلمان صرف اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو جان لینے سے ایمان کی حقیقی روح کو حاصل نہیں کر پاتا، بلکہ وہ اپنی زندگی میں ان کے اثرات کا مشاہدہ کر کے اسے پاتا ہے: یعنی مشکلات کے وقت اپنے دل کو 'الرحمٰن' سے وابستہ پانا، تقدیر کے فیصلوں کے سامنے 'الحکیم' کی ذات میں سکون و تسلی تلاش کرنا، اپنی کوتاہیوں کے باوجود 'الکریم' سے امید باندھنا، اور آزمائشوں میں 'العدل' پر بھروسا کر کے اطمینان محسوس کرنا۔ اس مقام پر عقیدہ محض یاد کیے گئے الفاظ سے ایک متحرک زندگی میں، اور بکھری ہوئی معلومات سے ایک دائمی جذبے و شعور میں بدل جاتا ہے جو فکر کی رہنمائی کرتا ہے، کردار کو سمت دیتا ہے اور قدموں کو ثابت قدم رکھتا ہے۔

درحقیقت امت ان لوگوں کی کثرت سے ترقی نہیں پاتی جو اسلام کا محض زبانی دعویٰ کرتے ہیں؛ بلکہ اس کا احیاء ان مردوں اور عورتوں سے ہوتا ہے جن کے دل اسلام سے لبریز ہوں، اس حد تک کہ اسلام ان کے خیالات پر حکمرانی کرنے والا جذبہ بن جائے، وہ پیمانہ بن جائے جس سے وہ زندگی کو تولتے ہیں، اور وہ نور بن جائے جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتے ہیں۔ آج کے دور میں ہمیں ایک ایسے ایمان کی کتنی شدید ضرورت ہے جو بدلتے حالات کے ساتھ متزلزل نہ ہو، فتنوں اور ترغیبات کے سامنے کمزور نہ پڑے، اور آزمائشوں کے بوجھ تلے نہ ٹوٹے، ایک ایسا ایمان جس کی جڑیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ دلی تعلق میں پیوست ہوں، نہ کہ محض یادداشت اور اس میں محفوظ معلومات میں۔ جب ایک مومن اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو قرآنِ مجید اس کے دل کی بہار بن جاتا ہے، عبادت اس کا سکون بن جاتی ہے، اور اسلام اس کی پوری زندگی بن جاتا ہے، نہ کہ زندگی کا محض ایک جزو۔

یہاں سے حقیقی استخلاف (زمین میں خلافت و نیابت) کا سفر شروع ہوتا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ استخلاف کا فریضہ ایسی امت کے سپرد نہیں کرتا جو اپنے دین کو صرف زبان سے محفوظ رکھتی ہو۔ بلکہ وہ اسے ایک ایسی امت کے سپرد فرماتا ہے جس کے دلوں میں ایمان رواں دواں ہو، ایک ایسی امت جو اس پر عمل کرتی ہے، اس کی خاطر قربانیاں دیتی ہے، اور اس پر ثابت قدم رہتی ہے، یہاں تک کہ اسلام وہ روح بن جاتا ہے جس کے سہارے وہ جیتی ہے اور وہ عالمگیر پیغام بن جاتا ہے جسے وہ دنیا تک پہنچاتی ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہماری امت اپنی اس طاقت اور اثر و رسوخ کا ادراک کرے جو اس کے پاس موجود ہے

وقت آ پہنچا ہے کہ امت اپنی اندرونی قوتوں اور اثر کی وسعت کو پہچانے، اور اس محتاجی و انحصار کی کیفیت سے نجات حاصل کرے جس نے اس کی تقدیر کو بڑی طاقتوں کے فیصلوں اور کشمکش سے باندھ رکھا ہے۔ ہماری سرزمینیں محض بین الاقوامی رقابت کا اکھاڑا نہیں ہیں؛ بلکہ وہ دنیا کا دھڑکتا ہوا دل، عالمی تجارت کا سنگم، اور وہ بحری راہداریاں ہیں جن سے قوموں کی دولت اور معیشتیں گزرتی ہیں۔ وہ امت جو ان آبناؤں، سمندروں اور اسٹریٹجک گزرگاہوں پر قابض ہے جہاں سے عالمی تجارت کا ایک وسیع حصہ گزرتا ہے، اسے ہرگز محض ایک تماشائی نہیں بنے رہنا چاہیے جبکہ دوسرے اس کے مستقبل کا خاکہ تیار کریں اور اس کی قسمت کا فیصلہ کریں۔

حقیقی طاقت محض ہتھیار رکھنے میں نہیں ہے، بلکہ ارادے اور خود مختاری کے اظہار میں، اور اپنے اسٹریٹجک مقام، دولت اور صلاحیتوں کو مؤثر طریقے سے بروئے کار لانے میں ہے۔ چنانچہ خود مختار فیصلہ سازی کی بحالی اور معاشی و سیاسی قوت کی تعمیر اب کوئی فکری عیاشی یا جذباتی نعرے بازی کی بات نہیں رہی؛ بلکہ یہ امت کے تحفظ اور اس کے وقار کی حفاظت کے لیے ناگزیر وجودی ضرورت بن چکی ہے۔ اگر بڑی طاقتیں ہماری سرزمینوں کی اسٹریٹجک اہمیت کی وجہ سے یہاں اثر و رسوخ کے لیے مقابلہ کرتی ہیں، تو ہمارے اپنے لوگوں کے لیے یہ کہیں زیادہ شایانِ شان ہے کہ وہ اس تہذیبی مقام کی بحالی کے لیے جدوجہد کریں جو ان کی عزت اور وقار کا مظہر ہے۔ تب ہم دوسروں کی مساوات میں محض ایک بے جان عدد نہیں رہیں گے، بلکہ ایک ایسی ہیبت ناک اور عظیم قوت بن جائیں گے جو واقعات کو جنم دیتی ہے اور طاقت کے عالمی توازن کو متاثر کرتی ہے، تاریخ کے ان اوراق کی بازگشت بن کر جب اسلامی امت نے اپنی تقدیر کی باگ ڈور خود سنبھال رکھی تھی اور اپنے پاس موجود ان اثاثوں اور مقامات کی قدر و قیمت کو پوری طرح سمجھتی تھی، جن کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں ملتی۔

اگر ہماری امت نے اسلام کو اپنا معیار نہ بنایا تو دوسروں کے نظریات اس کا معیار بن جائیں گے

اگر امتِ مسلمہ اپنے معاملات میں خود بات نہیں کرے گی، تو دوسرے اس کی طرف سے بولیں گے؛ اگر وہ اپنے منصوبے کی علمبردار نہیں بنے گی، تو دوسرے اپنے منصوبے اس پر مسلط کریں گے؛ اور اگر وہ اسلام کو اپنا معیار نہیں بنائے گی، تو دوسروں کے افکار اس کا معیار بن جائیں گے۔ اے امتِ مسلمہ کے لوگو! اسلام کو اپنے زمانے کے تابع نہ بناؤ؛ بلکہ اپنے زمانے کو اسلام کے معیار کے تابع کرو۔ یہ سوال نہ کرو کہ کافر استعماری مغرب سے آنے والی ہر چیز کے ساتھ اسلام کو ہم آہنگ کیسے کیا جائے؛ بلکہ یہ دریافت کرو کہ ہم اپنی زندگیوں کو دوبارہ اسلام کی طرف کیسے لوٹا سکتے ہیں۔ آج تمہاری امت کو کتنا شدید تقاضا ہے کہ وہ اپنا شعور، اپنے دین پر اعتماد، اپنی شناخت اور اپنا اتحاد دوبارہ حاصل کرے؛ تاکہ وہ ظلم، غلامی، جبر، لوٹ مار اور مغربیت کا مقابلہ کرنے میں اسلام کو اپنا مشعلِ راہ بنائے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ "اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طلبگار ہو گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا" [سورۃ آل عمران: آیت 85]۔

اے اللہ! امت کو اپنے دین کی طرف احسن طریقے سے واپس لوٹا دے؛ اسے اپنے دین کی گہری سمجھ، اپنی زمینی حقیقت کا ادراک، اور حق پر ثابت قدمی عطا فرما؛ اس کے درمیان عدل قائم فرما؛ اس کی صفوں کو اسلام پر متحد فرما؛ اور اسے ایک ایسی امت بنا دے جو تمام انسانیت تک اسلام کی رسالت (پیغام) پہنچانے والی ہو۔